تنظیمِ اسلامی

جون ۲۰۰۷ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

حالات کی سنگینی اور اُمید کی کرن

ملک وملت کو درپیش موجودہ سنگین حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مملکت خداداد پاکستان بھارت کی جھولی میں گرنے کے لیے تیار ہے۔ پاکستان میں جاگیردارانہ نظام، موجودہ حکومت کی نام نہاد روشن خیالی اور دہشت گردی کی امریکی جنگ میں شمولیت نے ہمیں خوفناک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس وقت بھارت عالمی سطح پر ایک اہم ملک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور ہمارے حالات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، کیونکہ ہندو ذہن نے پاکستان کے وجود کو دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ راہول گاندھی کے پیشتر ازیں پاکستان کو دولخت کرنے کا اس موقع پر دعویٰ کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا خاندان برسراقتدار آ کر دوبارہ یہ معرکہ انجام دے سکتا ہے۔

دوسری طرف ملک کے اندر مذہبی اور سیکولر عناصر کے درمیان نظریاتی اختلاف تصادم کی شکل اختیار کر رہا ہے، جس میں امریکہ کے زیر اثر متوقع مشرف، بے نظیر گٹھ جوڑ سے مزید شدت پیدا ہوسکتی ہے۔ مذہبی عناصر اگرچہ اسلام کے لیے ہر قربانی دینے کے جذبہ سے سرشار نظر آتے ہیں جس کی بہترین مثال لال مسجد کے دو بھائیوں کا نہایت جرأت مندانہ اقدام ہے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ باہمی اختلافات اور صحیح لائحہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے مذہبی طبقہ کا ملکی اور قومی سطح پر کوئی ٹھوس کردار ادا کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ حالات اگرچہ بظاہر سازگار نہیں ہیں تاہم احادیث میں مذکور محمد رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئیوں کے پیشِ نظر ہمیں یقین ہے کہ اسلام کا احیاء بالآخر اسی سرزمین پاک و ہند سے ہوگا جس میں افغانستان کا کردار سب سے اہم ہوگا۔

حکومتی اندازوں کے برعکس وکلاء برادری نے جس حیرت انگیز طاقت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے حکومت کی عمل داری کو شدید دھچکا لگا ہے، لیکن متبادل کے طور پر بھی کوئی ایسی طاقت موجود نہیں جو ملک کی گرتی دیواروں کو سہارا دے سکے۔ ان حالات میں موجودہ حکومت کی معمولی سی کوتاہی پاکستان کو کسی بہت بڑے خطرے سے دوچار کرسکتی ہے۔○○

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سلسلۂ تقاریر ④

حیاتِ طیبہ کا مدنی دَور

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾ (الحج)...... صدق اللہ العظیم

گزشتہ نشست میں ہم نے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے اس دَور پر جو اجرائے وحی سے شروع ہوا اور ہجرت پر ختم ہوا' اور اس کے کچھ اہم واقعات اور اُن مراحل پر جن سے ان تیرہ سالوں میں دعوتِ نبویؐ گزری تھی' غور کیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں حالات بالکل ہی مایوس کن ہو چکے تھے' اُمید کی کوئی کرن کسی طرف سے نظر نہ آتی تھی' یہاں تک کہ آنحضور ﷺ خود دل برداشتہ ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے' لیکن وہاں سے دُنیوی اعتبار سے ناکام لوٹنا پڑا۔ اس کے بعد از خود ایک کھڑکی کھل گئی۔ مدینہ منورہ سے چھ افراد ۱۱ نبوی میں ایمان لائے' ۱۲ نبوی میں وہ بارہ ہو گئے' جبکہ ۱۳ نبوی میں

یہ تعداد ۷۲ تک پہنچ گئی۔ یوں مدینہ منورہ میں ابھی نبی مکرم ﷺ کے قدم مبارک پہنچے بھی نہیں تھے اور وہاں آپؐ کی دعوت کامیابی کے مراحل طے کرنے لگی۔ یہ آپؐ کے ایک جاں نثار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی ایک سالہ تبلیغ کا نتیجہ تھا۔

اس ضمن میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ اس میں کسی انسانی کوشش کو دخل نہیں' یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ میں اس بات کی قدرے وضاحت کرنا چاہتا ہوں' اس لیے کہ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ ایک طرف تو یہ بات جان لیجیے کہ انسان اُس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ لیکن دوسری طرف اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انسانی کوشش اور سعی و جہد کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے بَین بَین ہے۔ مَیں اگر یہ سمجھوں کہ مَیں محض اپنے ارادے سے اپنے ہاتھ کو جنبش دے سکتا ہوں تو یہ بھی شرک ہو جائے گا۔ یہ شرک فی القدرۃ اور شرک فی الارادہ ہے۔ قدرت اور ارادہ صرف اللہ کا ہے کہ وہ جو چاہے کر گزرے' وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔ ماسویٰ اللہ کے لیے محض اپنے ارادے سے اپنی انگلی تک کو حرکت دینا ممکن نہیں۔ چنانچہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو مساعی نبی اکرم ﷺ نے فرمائیں اور آپؐ کے ساتھیوں نے جو محنتیں کیں' جو مشقتیں اٹھائیں' جس طرح جان و مال کو کھپایا' یہ اپنی جگہ مسلّم ہے' اس کی نفی نہیں ہوگی۔ اور اسی سے درحقیقت ہم پر اتمامِ حجت ہوتی ہے۔ ہر طرح کے حالات میں کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے' لیکن یہ کہ کون سی کوشش کس وقت بارآور ہو' اس کا فیصلہ کلیۃً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ان دونوں باتوں کو بیک وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری

مدینہ منورہ کو دار الہجرت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ نبی اکرم ﷺ ۸ ربیع الاول ۱۳ نبوی کو قبا میں تشریف آور ہوئے اور تقریباً دو ہفتے آپؐ نے وہاں قیام فرمایا۔ وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی بنیاد رکھی' جو ''مسجد قبا'' کے نام سے معروف ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۴۱ ملاحظہ ہو:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا

بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ﴾

''وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں غلبہ واقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔''

غور فرمائیے کہ اس غلبے اور تمکن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ چنانچہ اگر مشیتِ خداوندی نہ ہوتی اور مدینہ میں یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ حالات کا رُخ کیا ہوتا! مشیتِ خداوندی کو اس میں فیصلہ کن دخل حاصل ہے۔ دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ اس آیۂ مبارکہ کے مطابق اللہ کی طرف سے غلبہ واقتدار ملنے کے بعد اہلِ ایمان کا پہلا کام اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ہجرت کے بعد سب سے پہلے مسجد کی بنیاد رکھی۔ مدینہ منورہ پہنچنے پر بھی آپ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد نبویؐ کی تعمیر کا اہتمام فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمکن فی الارض عطا ہونے کے بعد اب بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے تکمیلی مرحلے یعنی غلبہ واقامتِ دین کے لیے براہِ راست اقدام کا آغاز ہو گیا۔

مدینہ منورہ کا تمدنی پس منظر

مدینہ منورہ کے بارے میں یہ جان لیجیے' جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی اشارۃً عرض کیا تھا' کہ تمدنی اعتبار سے وہ مکہ معظّمہ سے ایک قدم آگے تھا۔ مکہ میں صرف ایک قبیلہ آباد تھا' جبکہ مدینہ میں پانچ بڑے اہم اور طاقتور قبیلے آباد تھے۔ یعنی مکہ میں اجتماعی زندگی ابھی قبائلی سطح پر تھی' لیکن مدینہ میں ایک شہری ریاست قائم تھی۔ پانچ قبیلوں نے مل جل کر باہم کچھ اصول طے کر کے وہاں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی۔ ان میں دو قبیلے اوس اور خزرج اصل عرب قبیلے تھے' جن کی حیثیت گویا مالکانِ دیہہ کی تھی۔ ان کے علاوہ تین اور قبائل یہود کے تھے' جن کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کب اور کیوں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ البتہ ایک گمان ہے کہ یہ لوگ درحقیقت یہاں اس پیشین گوئی کی بنیاد پر آئے تھے کہ آخری نبی کا ظہور کھجوروں کے جُھنڈ رکھنے والی سرزمین میں ہو گا۔ اسی پیشین گوئی کی بنیاد پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو راہنمائی ملی تھی۔ ایک عیسائی راہب نے اُن

سے کہا تھا کہ میرا علم یہ بتاتا ہے کہ اب نئی نبوت کے ظہور کا وقت قریب ہے اور اس کا ظہور کھجوروں کی سرزمین میں ہوگا' چنانچہ انہوں نے ادھر کا سفر اختیار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے قبائل اسی اُمید میں یثرب آئے تھے کہ تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق اس سرزمین میں آخری اور کامل نبوت کا ظہور ہونے والا تھا۔ واللہ اعلم !

جیسا کہ میں نے عرض کیا ان پانچ قبائل میں سے دو یعنی اوس اور خزرج تو گویا مالکانِ دیہہ تھے' اور یہود کے متعلق یوں سمجھ لیجیے کہ یہ ساہوکاروں کے تین خاندان تھے' جو وہاں آباد تھے۔ خزرج کا قبیلہ بڑا تھا اور اوس کا چھوٹا۔ اُن کے مابین اکثر خانہ جنگی رہتی تھی اور یہودیوں کو موقع ملتا تھا کہ کبھی ایک اور کبھی دوسرے قبیلے کا ساتھ دے کر رفتہ رفتہ مدینہ منورہ پر اپنا تسلط اور اپنی گرفت مضبوط کرتے جائیں۔ یہاں تک کہ یہ اوس و خزرج بیچارے اکثر و بیشتر ان کے دست نگر رہتے تھے۔ مالی اعتبار سے ہندو بنیوں اور یہودیوں کا جو کردار ہمیشہ رہا ہے وہ کسے معلوم نہیں؟ یہودی ایک تعلیم یافتہ قوم تھے' ان کے پاس آسمانی کتاب تھی یعنی تورات' ان کے ہاں شریعت تھی' قانون اور ضابطہ تھا' اُن کے ہاں فقہاء تھے' ان کے ہاں عدالتیں ہوتی تھیں جو فیصلے کرتی تھیں۔ اس اعتبار سے یہودی ایک متمدن قوم تھے۔ مگر اوس وخزرج کے ہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ لہٰذا ہر اعتبار سے یہودیوں کا پلڑا بھاری تھا۔

اب صورت یہ ہوئی کہ اوس وخزرج کے لوگ نبیٔ آخر الزمان ﷺ پر ایمان لے آئے۔ البتہ وہ اس طور سے ایمان نہیں لائے تھے جس طرح مہاجرین ایمان لائے تھے' بلکہ وہ تو قبیلے کی سطح پر ایمان لائے تھے۔ ان میں جو سربرآوردہ افراد (Elders of the Clan) تھے انہوں نے فیصلہ کیا اور پورا قبیلہ ایمان لے آیا۔ تو آنحضور ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہ دونوں قبیلے ایمان لا چکے تھے۔ لیکن ان سب لوگوں کے ایمان کی کیفیت یکساں نہ تھی۔ بے شک ان میں وہ بھی تھے جو راسخ الایمان تھے' مگر ایسے بھی تھے جو صرف اپنے خاندان اور قبیلے کی سطح پر فیصلے کی وجہ سے مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ان پر یہود کے بہت گہرے اثرات قائم رہے۔ درحقیقت یہی نقطۂ اتصال ہے کہ جہاں

سے نفاق کا مرض شروع ہوا۔ ایسے ہی لوگوں کو یہودیوں نے اپنا آلۂ کار بنایا اور ان ہی کے ذریعے سے یہود کو مسلمانوں کی جماعت میں ریشہ دوانیاں اور سازشیں شروع کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے کہ اُن سے یہود کے سابقہ تعلقات تھے' حلیف ہونے کا ایک تعلق تھا' پھر یہود کا ایک رعب بھی تھا۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں جن کی بنا پر نبی اکرمﷺ کو قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں۔

آنحضورﷺ کے اقدامات بغرضِ استحکام

رسول اللہﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مدنی دَور کے بارے میں مَیں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مغربی مفکرین نے بھی آپ کی تعریف میں تمام superlative ڈگریاں استعمال کی ہیں۔ ایک مدبر اور سیاست دان' معاملہ فہم' دُور اندیش انسان' ایک نہایت ماہر سربراہِ مملکت' حکمران' سپہ سالار' نہایت اعلیٰ درجے کا قانون ساز اور منصف' غرض ہر اعتبار سے تعریف کے جتنے الفاظ ممکن ہیں انہوں نے استعمال کیے ہیں۔ منٹگمری واٹ آپﷺ کے لیے ''یکے از عظیم ترین فرزندانِ آدم'' (One of the greatest sons of Adam) کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور ڈاکٹر مائیکل ہارٹ تاریخ انسانی کے سو عظیم ترین انسانوں میں آپﷺ کو سرفہرست رکھنے پر مجبور ہے۔ اب اس تدبر کا تھوڑا سا نقشہ ذہن میں جماتے چلیں۔

مدینہ تشریف آوری کے بعد سب سے پہلے آپﷺ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو مضبوط اور مستحکم (consolidate) کیا۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو آپؐ کے ساتھ مکہ سے مہاجر ہو کر' لٹ پٹ کر آئے تھے اور یہاں مدینہ میں اُن کا نہ تو کوئی ذریعۂ معیشت تھا اور نہ ہی اپنا کوئی مکان تھا۔ یہاں کے لوگ جو ایمان لائے' وہ انصار کہلاتے تھے۔ یہاں آکر سب سے پہلا کام جو آپؐ نے کیا وہ انصار اور مہاجرین کے مابین ''عقدِ مواخات'' تھا' جس کی نظیر تاریخِ نسلِ انسانی میں نہیں ملتی۔ چنانچہ انصار نے سگے بھائیوں سے بڑھ کر مہاجرین سے سلوک کیا۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے دو گھر تھے تو اُس نے ایک گھر اپنے انصاری بھائی کو دے دیا۔ اُس وقت کے جس معاشرے میں یہ ہو رہا ہے' اس کے

پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ یہاں تک ہوا کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں' اُس نے اپنے مہاجر بھائی کو لا کر گھر میں کھڑا کر دیا (اُس وقت تک حجاب کا حکم نازل نہیں ہوا تھا) اور کہا ان دونوں میں جو تمہیں پسند ہو میں اسے طلاق دے دیتا ہوں' تم اس سے شادی کر لو۔ اس درجہ کی اخوت ہو تو جماعت بنیانِ مرصوص بنتی ہے۔ اس کے بغیر قدم آگے اُٹھ ہی نہیں سکتا۔

دوسری طرف آپ ﷺ نے آتے ہی یہود سے معاہدے کر لیے اور انہیں گویا جکڑ لیا۔ یہود ان معاہدوں میں ایسے بندھے کہ بعد میں پیچ و تاب کھاتے رہے لیکن نبی اکرم ﷺ کی کھلم کھلا مخالفت نہ کر سکے۔ اس میں حکمت خداوندی بھی دیکھئے' اس کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ ہوئی ہے۔ مدینہ منورہ میں آنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہود کو کچھ احساس ہوا کہ یہ تو ہمارے متبعین میں سے ہیں' ہمارے camp followers ہیں' انہوں نے ہمارا قبلہ اختیار کیا ہے۔ گویا انہیں فوری طور پر یہ احساس نہ ہوا کہ نئی نبوت و رسالت ہماری سیادت و قیادت کی جڑیں کاٹ دے گی' بلکہ وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے کہ ٹھیک ہے' نبوت تو نئی ہے' لیکن بہرحال وہ ہمارے قبلے کے پیروکار ہیں۔ یہ تو جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو ان کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ معاملہ تو ایک نئی اُمت کے قیام کا ہے' ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی اُمت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کو سولہ سترہ مہینے مل گئے' جس میں آپؐ نے مدینہ منورہ میں اپنی پوزیشن کو پورے طور پر مستحکم کر لیا۔

راست اقدام کا مرحلہ

اس کے بعد اہم ترین واقعہ غزوۂ بدر ہے جو رمضان المبارک ۲ھ میں پیش آیا۔ اس کے بارے میں ہمارے ہاں کچھ مؤرخین نے خواہ مخواہ ایک معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو جنگ کا آغاز نہیں کیا تھا' صرف دفاع کیا تھا' اور یہ کہ اسلام میں مدافعانہ جنگ کی تو اجازت ہے' جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ جو صورت حال ہے اس کو آپ سمجھئے۔ اس پہلو سے تو کہا جا سکتا ہے کہ جنگ مسلمانوں پر

ٹھونس دی گئی کہ اہل ایمان کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ ظلم جو مکہ کی سرزمین پر روا رکھا گیا یہ گویا قریش کی طرف سے جنگ کا آغاز تھا۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیات میں اہلِ ایمان کو اذنِ قتال دیا گیا ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ﴿۳۹﴾ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ؕ﴾ (آیات ۳۹، ۴۰)

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا بلا کسی جرم کے' سوائے اس کے کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے!''

یہ آیات اثنائے سفر ہجرت میں نازل ہوئیں۔ اس اعتبار سے تو یقیناً آغاز قریش کی طرف سے ہو چکا تھا۔ لیکن متعین طور پر ہجرت کے بعد جو اقدام ہوا ہے وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر بالفرض قریش چڑھائی کر کے نہ آتے اور وہ صورت حال کو علیٰ حالہٖ (status quo) تسلیم کر لیتے کہ ٹھیک ہے' ہمارے سر سے بلا ٹلی' اب یہ مدینہ میں بیٹھے اپنی دعوت و تبلیغ کریں' ہم یہاں بیٹھے ہیں' تو کیا نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ کو مشرکین کے تسلط سے نکالنے کے لیے اور اللہ کے دین کو غالب و سربلند کرنے کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے اقدام نہ فرماتے؟ تو یہ بات سمجھ لیجیے کہ درحقیقت بعثتِ محمدیؐ کا جو امتیازی مقصد ہے ﴿لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ﴾ اس کے لیے اب اقدام خود نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہوا۔ چنانچہ غزوۂ بدر سے قبل رسول اللہ ﷺ نے آٹھ فوجی مہمات روانہ فرمائیں' جن میں سے چار میں آپؐ بنفس نفیس شریک ہوئے۔ ان مہمات کا مقصد مکہ کی معاشی ناکہ بندی تھا۔ قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ مدینہ منورہ اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے درمیان سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ یمن اور شام کے مابین تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کا واحد راستہ تھا۔ اس کی حیثیت معاشی اعتبار سے قریش کی رگِ جان (life line) کی تھی۔ آپ ﷺ نے ان کی اس رگِ جان پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کو مخدوش بنا دیا۔

اس ضمن میں ہجرت کے فوراً بعد کا ایک واقعہ بہت اہم ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اوس کے سردار تھے۔ آپ مدینہ سے مکہ گئے۔ وہاں آپ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوجہل نے دیکھ لیا اور کہا: تم نے ہمارے مفروروں کو پناہ دی ہے، اب ہم تمہیں یہاں نہیں آنے دیں گے اور طواف نہیں کرنے دیں گے۔ اس پر سعد بن معاذؓ نے جواب دیا کہ ذرا سوچ لو، ہم تمہارے قافلے نہیں گزرنے دیں گے۔ اس لیے کہ قریش کی ساری سیادت، ساری چودھراہٹ اور ساری خوشحالی کا دارومدار اس بات پر تھا کہ اہل عرب ان کے قافلوں سے تعرض نہیں کرتے تھے کہ یہ کعبہ کے متولی ہیں۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذؓ نے واضح کر دیا کہ ہم پر کعبہ کا راستہ بند کیا تو پھر وہ مراعات اور منفعتیں جو تمہیں حاصل ہیں، حاصل نہیں رہیں گی۔ بالکل وہی بات ہوئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھاپہ مار دستے بھیجے اور ان کے تجارتی قافلوں کو چاروں طرف سے مخدوش بنا دیا۔

مسلح تصادم کا آغاز

اس سلسلے کا اہم ترین واقعہ نخلہ کا ہے جس نے مکہ میں گویا آگ لگا دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو چند افراد کے دستے کا کمانڈر بنا کر ہدایت فرمائی کہ مکہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کرو اور قریش کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھو۔ وادیٔ نخلہ میں قیام کے دوران وہاں قریش کے ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی اور مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ اب اتفاقاً کہہ لیں یا مشیت الٰہی کہہ لیں، ہجرت کے بعد پہلا خون مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ مکہ میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا اور چیخ وپکار شروع ہوگئی کہ خون کا بدلہ خون!

دوسری طرف ابوسفیان کی سرکردگی میں جانے والا تجارتی قافلہ مال واسباب سے لدا پھندا اب شام سے واپس آ رہا تھا۔ چونکہ ابوسفیان کو کچھ اندیشہ ہو گیا تھا لہٰذا اُس نے مکہ مکرمہ کی طرف قاصد دوڑا دیے کہ ہوسکتا ہے ہم پر مسلمان حملہ کر دیں، لہٰذا ہماری حفاظت کے لیے ایک مسلح دستہ بھجوایا جائے۔ ادھر ابوجہل کا مزاج Hawks کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جنگ ہو، ہم فوج کشی کریں اور اسلام کے اس چراغ کو گل کر دیں۔ لہٰذا

اُس نے اس موقع سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور ایک واویلا مچا دیا کہ مکہ والو! تمہاری ساری دولت خطرے میں ہے' تمہارے تجارتی قافلے کو محمد (ﷺ) لوٹنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اُدھر سے ایک ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑا ہوا۔ اِدھر مشیت ِربانی کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ سے نکلنے کا حکم ہوا۔ مدینہ منورہ میں آنحضور ﷺ نے اپنا ارادہ واضح نہیں فرمایا' نفیرِ عام بھی نہیں تھی کہ ہر مسلمان ضرور چلے۔ آپ ایک جمعیت لے کر نکلے۔ ابھی آپ نے کچھ ظاہر نہیں فرمایا کہ کہاں جا رہے ہیں۔

غزوۂ بدر سے قبل مشاورت

مدینہ سے ذرا باہر نکل کر آپ نے مجلسِ مشاورت منعقد کی اور فرمایا: مسلمانو! دو جماعتیں ہیں' ایک قافلہ شمال سے آ رہا ہے' اُس کے ساتھ بہت سا مالِ تجارت ہے' صرف پچاس محافظوں کا ایک دستہ اُس کے ساتھ ہے۔ جبکہ ایک اور لشکر جنوب سے آ رہا ہے جو کیل کانٹے سے لیس ہے' اور اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک پر فتح کا وعدہ فرمایا ہے۔ مسلمانو! بتاؤ' کدھر کا قصد کریں؟ سورۃ الانفال میں اس پوری مشاورت کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ: ﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ (الانفال:۷) ''اور (اے مسلمانو!) تم تو چاہتے تھے کہ تمہیں وہ جماعت ملے جس میں تمہیں کانٹا نہ چبھے''۔ بہرحال بر بنائے طبع بشری یہ تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا کہ لقمۂ تر کو چھوڑ کر لوہے کے چنے کو چبانے کی کوشش کرے' سوائے اُن لوگوں کے جو طے کر چکے ہوں کہ تن من دھن اللہ کی راہ میں لگا دیں گے۔ چنانچہ اس جماعت میں بھی کچھ لوگ وہ تھے جن کی رائے یہ ہوئی کہ قافلے کی طرف چلنا چاہیے۔

نبی اکرم ﷺ نے یہ مشورہ دراصل ساتھیوں کے عزم و حوصلہ (morale) کو دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ اندازہ ہو جائے کہ ان کی سوچ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مشورہ طلب کر رہے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشورہ دے رہے ہیں۔ ایک اپنی بات کہہ رہا ہے تو دوسرا اپنی۔ ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تقریر کرتے ہیں کہ حضور ﷺ! ہمیں لشکر کی طرف چلنا چاہیے۔ آپؐ متوجہ نہیں ہو رہے۔ مہاجرین میں سے کچھ اور حضرات نے

تقریریں کیں، حضورﷺ نے اہمیت نہ دی۔ آخر میں حضرت مقدادؓ نے بڑی پیاری تقریر کی کہ حضورؐ! ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہ ساتھی نہ سمجھئے جنہوں نے جنگ کا مرحلہ آنے پر کہہ دیا تھا کہ:﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾(المائدۃ) یعنی اے موسیٰؑ! ''جاؤ تم اور تمہارا ربّ جا کر جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں''۔ ہم وہ نہیں ہیں، لیکن آنحضورﷺ ادھر بھی التفات نہیں فرما رہے۔ اب انصار کو خیال ہوا کہ معاملہ اصل میں ہم سے متعلق ہے اور رسول اللہﷺ ہماری رائے کا انتظار فرما رہے ہیں۔ اس لیے کہ بیعت عقبہ ثانیہ جس کے نتیجے میں مدینہ منورہ دار الہجرت بنا اور آنحضورﷺ یہاں تشریف لائے، اس میں یہ چیز شامل نہیں تھی کہ انصار مدینہ سے باہر نکل کر بھی آپﷺ کے ساتھ ہو کر جنگ لڑیں گے۔ اس کی رو سے تو اگر مدینہ پر کوئی حملہ کرے اور وہاں رسول اللہﷺ کو کوئی گزند پہنچانا چاہے، تب انصار پابند تھے کہ وہ آپؐ کی حفاظت کریں گے۔ اس سے زیادہ کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ خزرج کے رئیسِ اعظم حضرت سعد بن عبادہؓ نے یہ بات بھانپ لی اور کھڑے ہو گئے۔ خزرج بہت بڑا قبیلہ تھا، اس کی تعداد اوس کے مقابلے میں کم سے کم تین گنا تھی۔ چنانچہ رئیس انصار اصل میں یہی تھے۔ ان کی تقریر بڑے معرکے کی تقریر ہے۔ انہوں نے کہا حضورؐ! اس بیعت عقبہ والے معاملے کو اب آپ بھول جائیے، اِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں اور آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اب آپؐ کا جو ارادہ ہو، جو قصد ہو، بسم اللہ کیجیے! اگر آپ ہمیں سمندر کے کنارے لے جا کر کھڑا کر دیں گے اور اس میں چھلانگ لگانے کے لیے کہیں گے تو ہم بے دریغ اس میں چھلانگ لگا دیں گے۔ آپؐ کا جدھر چلنے کا ارادہ ہے چلیے۔ یعنی کسی تردّد کو اپنے پاس نہ پھٹکنے دیجیے۔ اب یہاں معاملہ اللہ کے رسولؐ اور اس کی اُمت کا ہے۔ چنانچہ رسول اللہﷺ نے فیصلہ فرمایا اور قافلہ بدر کو روانہ ہو گیا۔

غزوۂ بدر: یوم الفرقان

دیکھئے عجیب بات ہے کہ مشیت ایزدی بعض اوقات بندوں کی مشیت کے ساتھ آ کر منطبق ہو جاتی ہے۔ بدر میں بھی یہی معاملہ ہوا کہ ایک طرف دشمنِ خدا چاہتا تھا کہ

جنگ ضرور ہو۔ اسے اپنی طاقت کا غرہ تھا اور وہ ایک ہزار کا کیل کانٹے سے مسلح لشکر لے کر آیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی فتح یقینی ہے۔ لہٰذا اُس نے کہا تھا کہ یہ دن ''یومِ فرقان'' ہو گا۔ قرآن مجید نے بھی سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کو ''یوم الفرقان'' کا نام دیا ہے۔ یہ اصل میں اسی کا دیا ہوا نام ہے' جس کو قرآن نے اختیار کر لیا۔ ابوجہل کا کہنا تھا کہ آج طے ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر! اور یہ اس لیے کہہ رہا تھا کہ اس کو اپنی فتح کا یقین تھا۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری مشیت بھی یہی تھی کہ ٹکراؤ ہو' ہم بھی یہ چاہتے تھے کہ حق اور باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَیُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۚ﴾ (الانفال) ''تا کہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اور ﴿لِّیَہۡلِکَ مَنۡ ہَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ وَّیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ ؕ﴾ (الانفال:۴۲) ''تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ دلیلِ روشن کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیلِ روشن کے ساتھ زندہ رہے''۔ اب خدائی مشیت اور ابوجہل کی مشیت نتیجے کے اعتبار سے ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی۔

یہ بھی جان لیجیے کہ قریش میں مزاج کے اعتبار سے دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک جنگجو اور مشتعل مزاج (Hawks) اور دوسرے بردبار طبیعت کے حامل امن پسند لوگ (Doves)۔ میں نے گزشتہ نشست میں ایک شریف النفس شخص مطعم بن عدی کا ذکر کیا تھا جو طائف سے واپسی پر نبی اکرم ﷺ کو اپنی امان میں مکہ لے کر گیا تھا۔ اسی طرح عتبہ ابن ربیعہ ایمان اگرچہ نہیں لایا' کفر ہی پر مرا' لیکن اس میں شرافت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تصادم ہو۔ حکیم بن حزامؓ جو بعد میں ایمان بھی لے آئے' وہ بھی چاہتے تھے کہ تصادم نہ ہو۔ یہ دونوں آپس کی خونریزی سے بچنا چاہتے تھے' لہٰذا انہوں نے تحریک شروع کی کہ جس مقصد کے لیے ہم آئے تھے وہ تو پورا ہو گیا' ہمارا قافلہ تو محفوظ نکل گیا' اب خون ریزی کی کیا ضرورت ہے! عتبہ بن ربیعہ بڑا دُور اندیش اور دانش مند شخص تھا۔ اس نے قریش سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اب تم محمد (ﷺ) کے خلاف کوئی اقدام مت کرو' بلکہ انہیں عرب کے حوالے کر دو' وہ خود نبٹ لیں گے۔ اگر محمدؐ جیت گئے تو آخر وہ ہمارے ہی تو ہیں'

ان کی جیت ہماری ہی جیت ہوگی۔ ایک قرشی اگر پورے عرب پر غالب آ جاتا ہے تو یہ قریش ہی کا غلبہ ہے' اور اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا اور تمہیں خواہ مخواہ اپنے بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہیں کرنے پڑیں گے۔

یہ بات اتنی وزنی تھی کہ پورے لشکر میں پھیل گئی کہ ٹھیک ہے' جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ دوسری طرف Hawks کا سرخیل ابوجہل ڈٹا ہوا تھا کہ جنگ ہوگی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف فوری اقدام کیا جائے۔ اُس نے واقعۂ نخلہ کے مقتول عمرو بن عبداللہ الحضرمی کے بھائی کو بلایا اور اُسے انتقام لینے کے مطالبے پر اُکسایا۔ چنانچہ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے' چیخنا اور پکارنا شروع کر دیا کہ یہ غداری ہو رہی ہے' میرے بھائی کے خون کا بدلہ لیا جانا چاہیے۔ ابوجہل نے عتبہ بن ربیعہ کو بھی عرب حمیت کے حوالے سے طعنہ دیا کہ تم بزدلی دکھا رہے ہو۔ اس نے کہا کل میدانِ جنگ میں پتا چلے گا کہ بزدل کون ہے! گویا عربی حمیت جوش میں آ گئی اور اس طرح جنگ ہو کر رہی۔

رسول اللہ ﷺ کی دُعا

اب ذرا جنگ سے پہلی رات کا تصور کیجیے۔ اُدھر ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس لشکر اور اِدھر صرف تین سو تیرہ آدمی' ستر اونٹ اور دو گھوڑے۔ تلواریں بھی سب کے پاس نہیں۔ وہ تو مدینہ سے جنگ کے لیے نکلے ہی نہ تھے' نہ انہیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا۔ پھر قوم وہ ہے جس کو عرب میں لڑاکا قوم سمجھا ہی نہیں جاتا تھا' یعنی انصار——اور صبح ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ دونوں فوجوں کے عین بیچوں بیچ گھانس پھونس کی ایک جھونپڑی بنائی گئی ہے جس کے اندر اللہ کے رسول ﷺ سربسجود ہیں۔ اُس رات آپ ﷺ نے بڑا طویل سجدہ کیا' جس میں بڑی طویل دعا کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ننگی تلوار لیے ہوئے پہرے پر کھڑے ہیں۔ اُس رات کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول ملتا ہے کہ ہم میں سب سے زیادہ شجاع ابوبکرؓ تھے۔ اس لیے کہ اُس شب کو جو سب سے زیادہ خطرناک شب تھی' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے پہرے دار ابوبکرؓ تھے۔ اُس وقت آپ ﷺ نے جو دعا مانگی ہے اگرچہ اس میں بہت ہی عاجزی اور تضرع تھا' تاہم نیاز سے بڑھ کر اُس میں ناز

کا انداز تھا۔ اس دعا میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اے اللہ! اگر یہ لوگ کل یہاں ہلاک ہو گئے تو پھر قیامت تک تجھے پوجنے والا کوئی نہ ہوگا!...... یہ بات آپ ﷺ نے اس لیے فرمائی کہ آپ آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے بارگاہِ ربّ العزت میں مزید عرض کیا کہ پروردگار! یہ میری پندرہ برس کی کمائی ہے جو مَیں نے میدان میں لا کر ڈال دی ہے! اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! بس کیجیے، بس کیجیے، یقیناً اللہ آپ کی مدد فرمائے گا۔ پھر آپ ﷺ نے پیشانی اٹھائی اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ (القمر) گویا اللہ کی طرف سے خوشخبری تھی کہ ”عنقریب اس جمعیت کو شکست ہو کر رہے گی اور یہ پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے“۔ چنانچہ آپؐ نے صبح کے وقت نشان دہی فرما دی کہ فلاں کافر فلاں جگہ قتل ہوگا۔

بدر کا معرکۂ کارزار

غزوۂ بدر حقیقی معنی میں یوم الفرقان ثابت ہوا اور اس میں قریش کے ستر سربرآوردہ لوگ مارے گئے۔ ابوجہل دو انصاری نوجوانوں حضرت معاذ اور معوذ رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں قتل ہوا۔ یہ دونوں teenagers تھے۔ عین معرکے کے دوران یہ دونوں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے آکر پوچھتے ہیں چچا جان! ہم نے سنا ہے کہ ابوجہل نامی کوئی شخص مکہ کا باشندہ ہے جس نے ہمارے نبی ﷺ کو بہت زیادہ ایذائیں پہنچائی ہیں، ہمیں بتا دیجیے وہ کہاں ہے۔ انہوں نے اشارہ کیا وہ ہے ابوجہل۔ اُس کی حیثیت سپہ سالار کی تھی اور وہ گھوڑے پر سوار کسی خاص مقام پر کھڑا تھا۔ یہ دونوں تیر کی طرح وہاں پہنچے۔ ظاہر بات ہے اس کا کوئی باڈی گارڈ دستہ بھی ہوگا، مگر کسی کو سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ دونو جوان دوڑتے ہوئے گئے اور اُس پر اچانک حملہ کر کے اسے زمین پر گرا دیا۔ جب اس کی گردن کاٹنے لگے تو وہ کہنے لگا کہ گردن ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ جب میرا سر نیزے پر رکھو تو اونچا نظر آئے، معلوم ہو کہ کسی سردار کا سر ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ اُس کی لاش پر آئے اور آپؐ نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا تو فرمایا: ((هٰذَا فِرْعَوْنُ اُمَّتِیْ))(۱)

---

(۱) مسند احمد

''یہ میری اُمت کا فرعون ہے''۔ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی وہ بات صحیح ثابت کر کے دکھا دی جو اُس نے ابوجہل کے جواب میں کہی تھی۔ چنانچہ پہلا شخص جو میدانِ جنگ میں آیا' وہی تھا اور وہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو ساتھ لے کر نکلا تھا۔ وہ خود حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔

یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ شروع میں جب کفار کی طرف سے تین افراد نکلے اور ادھر سے تین انصاری ان کے مقابلے کے لیے نکلے تو عتبہ نے چیخ کر کہا اے محمد! ہماری توہین نہ کرو' یہ ہمارے مقابل کے لوگ نہیں ہیں' ہم ان کاشت کاروں سے لڑنے کے لیے نہیں آئے' ہمارے مقابلے کے لیے انہیں بھیجو جو ہمارے مدمقابل ہیں۔ تب حضرت حمزہ' حضرت عبیدہ بن حارث اور حضرت علی رضی اللہ عنہم مقابلے کے لیے نکلے۔

غزوۂ بدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد میں مسلح تصادم (Armed conflict) کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور فیصلہ کن معرکہ بھی یہی تھا جس نے تاریخ کو بدل دیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ دو فریقوں میں باہم کوئی نسبت ہی نہیں تھی۔ اتنا بڑا لشکر کیل کانٹے سے مسلح ہوا اور غرقِ آہن ہو کر آئے اور پٹ جائے اس چھوٹے سے دستے کے ہاتھوں جن کی اکثریت کاشت کار تھی اور وہ جنگجو لوگ بھی نہ تھے۔ ان کے پاس کوئی ساز و سامان نہیں تھا' اسلحہ نہیں تھا۔ تو معلوم ہو گیا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ درحقیقت یہی بات ہے جس کی وجہ سے اس دن کو ''یوم الفرقان'' کہا گیا۔

غزوۂ بدر کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے عرب میں اہل ایمان کی دھاک بیٹھ گئی اور لوگ تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف آنے لگے۔ چنانچہ اگلے سال غزوۂ اُحد میں اوس وخزرج میں سے اگر کچھ لوگ ابھی مذبذب تھے تو اُن کے دل بھی ٹھک گئے کہ بات یہی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح جو نفری آئی اللہ تعالیٰ نے اس کی چھانٹی کی۔ غزوۂ اُحد کی حکمت کو ذہن میں رکھیے کہ یہ درحقیقت تطہیر اور چھانٹی (purge) کے لیے تھا کہ یہ کچے پکے لوگوں کی بھیڑ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئی ہے' اس میں سے ناپختہ لوگوں کو الگ کر دیا

جائے۔ ابھی تو عالمی سطح پر انقلاب کے لیے بڑی محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔ اس فتح کے نتیجے میں اگر ناپختہ لوگ جمع ہو گئے تو جماعت بحیثیت مجموعی کمزور ہو جائے گی۔

غزوۂ اُحد

غزوۂ بدر کے ایک ہی سال بعد شوال ۳ ہجری میں مشرکین مکہ کا جوابی حملہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ہوا جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ تین ہزار کا لشکر پورے اہتمام کے ساتھ حملہ آور ہوا اور ان کی ہمتیں دیکھئے کہ عین مدینہ منورہ تک پہنچ گئے۔ دامنِ اُحد جہاں یہ معرکہ ہوا' مدینہ سے کل چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس موقع پر مشاورت ہوئی کہ کیا کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنی رائے یہی تھی کہ شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ یہاں پھر دیکھئے' کون کون سی دو رائیں یکجا ہو رہی تھیں! تاریخ کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جائے تو بڑا دلچسپ ہے۔ غزوۂ بدر میں مشیت خداوندی اور خواہشِ ابوجہل یکجا ہوگئی اور یہاں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رائے اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی رائے ایک ہوگئی۔ عبداللہ بن اُبی خزرج کا بہت بڑا سردار تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل اس بات کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کو مدینہ کا بادشاہ مان لیا جائے گا۔ اس کے لیے تاج تیار ہو چکا تھا' صرف تاجپوشی کی رسم باقی تھی کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور اس کی بادشاہی اور سیادت وقیادت کا چراغ گل ہو گیا۔ لہٰذا اس کے دل میں جو عداوت اوّل روز سے محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے تھی' اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ قبائلی اثرات کے تحت وہ بھی ایمان تو لے آیا لیکن وہ منافقِ اعظم ثابت ہوا۔ اس کی بھی رائے یہ تھی کہ ہماری اتنی طاقت نہیں ہے کہ کھلے میدان میں جا کر تین ہزار کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں' لہٰذا مدینہ میں محصور ہو کر جنگ کی جائے۔ اس نے کہا تھا کہ یارسول اللہ! مدینہ کی تاریخ یہی ہے کہ جب بھی ہم نے باہر نکل کر مقابلہ کیا تو اکثر ہمیں زک اٹھانی پڑی' اور جب ہم نے اندر محصور ہو کر مقابلہ کیا تو دشمن کے فوجیوں سے ہمارے نوجوان لڑتے تھے اور اوپر سے ہماری عورتیں اور بچے ان پر سنگ باری کرتے تھے' اور مخالف تنگ جگہوں پر بٹ کر آتے تھے' لہٰذا ہم جیت جاتے تھے۔

آنحضورﷺ کی اپنی رائے بھی یہی تھی، لیکن ایک تو اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات کھلے میدان میں جنگ کرنے کے حامی تھے' دوسرے یہ کہ نوجوانوں کی طرف سے بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ ہورہا تھا' خاص طور پر وہ نوجوان جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے یا فتحِ بدر کے بعد ایمان لائے تھے' ان کا جوش وخروش دیدنی تھا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کرنی چاہیے۔ چنانچہ نبی اکرمﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور ان حضرات کی بات مان لی۔ فیصلہ ہوگیا کہ کھلے میدان میں لڑیں گے۔ اس کے بعد آپﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے اور برآمد ہوئے تو آپؐ نے زرہ پہنی ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی جس پر لوگوں کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے چاہا کہ اپنی رائے واپس لے لیں' مگر رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔ سورۂ آل عمران میں اسی کا حکم ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۵۹) ''اور آپ ان سے معاملات میں مشورہ لیجیے' پس جب آپ فیصلہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجیے''۔ یعنی جب فیصلہ کرلیں تو پھر ڈٹ جائیں اور اللہ پر بھروسہ کریں۔ یہ بار بار کے فیصلے بدلنے اچھے نہیں۔

دامنِ اُحد میں جنگ کا آغاز ہوا اور پہلے ہی ہلے میں اللہ کی مدد ونصرت آئی اور بدر کا نقشہ سامنے آگیا۔ رسول اللہﷺ نے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ ایک انتہائی حساس درے پر تعینات فرمایا تھا۔ جب مشرکین کے قدم اکھڑ گئے تو مسلمانوں کی ایک جماعت نے ان کا پیچھا کیا اور ایک جماعت مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئی۔ اس صورت حال میں درّے پر تعینات تیراندازوں میں سے اکثر نے یہ کہا کہ اب تو فتح ہوگئی ہے' اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ ان کے کمانڈر نے انہیں اس سے روکا' لیکن وہ ان کی حکم عدولی کرتے ہوئے نیچے اتر آئے اور مالِ غنیمت سمیٹنے لگے۔ قریش کی فوج کے ساتھ دو سو گھڑسواروں کا دستہ تھا جس کے سپہ سالار خالد بن ولید تھے۔ ان کی عقابی نگاہ نے جب درّہ خالی دیکھا تو گھڑسوار دستے کے ساتھ اُحد کا چکر کاٹ کر اُس درّے کے راستے

مسلمانوں کے عقب سے حملہ آور ہو گئے۔ درّے پر صرف پندرہ تیر انداز باقی رہ گئے تھے جو شہید ہو گئے۔ خالد بن ولید کے عقبی حملہ نے مسلمانوں کو سراسیمہ کر دیا۔ دوسری طرف بھاگنے والے کفار نے صورت حال میں تبدیلی دیکھی تو انہوں نے پلٹ کر زوردار حملہ کر دیا۔ اب مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ گئے اور فتح شکست میں بدل گئی۔

سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد پر بڑی تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے کہ مسلمانو! تمہیں جو زک اٹھانی پڑی وہ اس لیے اٹھانی پڑی کہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ تم اپنی کمزوریوں سے واقف ہو جاؤ۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰٮكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ﴾ (آیت۱۵۲)

''(مسلمانو! تم اپنی شکست کا اللہ کو کوئی الزام نہیں دے سکتے) اللہ نے تو (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ پورا کر دکھایا' جبکہ تم اس کے حکم سے اپنے دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ مگر جب تم ڈھیلے پڑے' تم نے معاملہ میں اختلاف کیا' اور تم (اپنے امیر کی) حکم عدولی کر بیٹھے' بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی (یعنی فتح) جو تمہیں محبوب تھی (تو اللہ نے تمہیں پسپا کر دیا)۔ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔''

عبداللہ بن اُبی جنگ سے پہلے ہی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا تھا۔ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی جماعت میں اب منافقین کا عنصر شامل ہو چکا ہے۔ نبی اکرم ﷺ ایک ہزار کو لے کر نکلے تھے' تین سو چلے گئے تو تین ہزار کے مقابلے میں صرف سات سو رہ گئے۔ ابتدائی فتح کے بعد شکست ہوئی اور ستر مسلمان دامنِ اُحد میں شہید ہوئے۔ یہ بالکل وہی تعداد ہے جو میدانِ بدر میں مشرکین کے مقتولین کی تھی۔ ارشاد ہوا: ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ (آل عمران: ۱۴۰) ''اور ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں!''

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے' وہ مصعب بن عمیرؓ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ ان کے کپڑوں کا ایک ایک جوڑا دو دو سو درہم کا ہوتا تھا اور شام سے ڈھل کر آیا کرتا تھا۔ معطر لباس پہنے ہوئے مکہ کی گلیوں میں نکلا کرتے تھے تو اشارے ہوتے تھے کہ دیکھو وہ کون جا رہا ہے! محمد ﷺ پر ایمان لائے اور مُقری بنا کر مدینہ منورہ بھیج دیے گئے۔ قبولِ اسلام کے بعد حال یہ ہو گیا کہ بدن پر سوائے پیوند لگے ہوئے کمبل کے اور کچھ نہیں۔ واقعہ آتا ہے کہ آنحضور ﷺ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے کہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کا سامنے سے گزر ہوا' ان کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی کملی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ نوجوان کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا! جب دامنِ اُحد میں انہیں شہادت کا مرتبہ ملا تو تدفین کے وقت یہ مسئلہ سامنے آیا کہ شہید کا تو کوئی کفن نہیں ہوتا سوائے ان کپڑوں کے جو اُس وقت اس کے بدن پر ہوں' اور ان کے بدن پر ایک ہی چادر تھی جو اتنی چھوٹی تھی کہ پورے جسم کو ڈھانپ نہیں پا رہی تھی۔ اگر سر کو ڈھانپتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں کو ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا۔ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا کہ کیا کیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان کے سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ یہ آخری لباس ہے اُس دو دو سو درہم کا جوڑا پہننے والے نوجوان کا!

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اُن کی لاش کا مثلہ ہوا' کلیجہ چبایا گیا۔ اُس وقت جو قلب محمدیؐ پر بیت رہی ہو گی آپ ذرا اُس کا تصور کیجیے۔ آخر آپ ﷺ کے سینے میں کوئی پتھر کا ٹکڑا تو نہیں تھا' بڑا حساس قلب تھا۔ جو کچھ بیت رہی تھی اس کا اظہار ہوا۔ آپؐ مدینہ تشریف لائے تو سارا شہر ماتم کدہ بنا ہوا تھا' ہر گھر سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اُس وقت آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ آئے: ((لٰكِنَّ حَمْزَةَ لَا بَوَاكِيَ لَهُ!))[1] (حمزہ کے لیے تو کوئی رونے والی بھی نہیں!)۔ انصار اپنے گھروں میں گئے اور اپنی خواتین کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن اور آپ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا۔

---

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب الجنائز' باب ما جاء فی البکاء علی المیت۔

رسول اللہ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے‘ خود کی کڑیاں تلوار کے شدید وار کی وجہ سے پیشانی کی ہڈی میں گھس گئیں۔ آپؐ پر غشی طاری ہوئی۔ یہ بھی مشہور ہوگیا کہ آپ ﷺ کا انتقال ہوگیا ہے۔ ان سارے واقعات کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔

غزوۂ احزاب

غزوۂ اُحد میں ہزیمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدر کی فتح کے بعد جو فضا بنی تھی‘ اب اُس کے بالکل برعکس ہوگئی۔ وہ دھاک جو بیٹھی تھی‘ ختم ہوگئی اور مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی۔ لہٰذا اب جو وقت آیا وہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی شدید ترین تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بھی۔ چاروں طرف سے قبائل کے حوصلے بلند ہوگئے۔ صورت حال یہ ہوگئی کہ آج اِدھر سے آ کر کوئی چھاپہ مار گیا تو کل اُدھر سے آ کر کوئی حملہ کر گیا‘ کوئی اونٹ لے کر نکل گیا اور کوئی آ کر نخلستانوں میں آگ لگا گیا۔ ادھر یہودی بھی شیر ہو گئے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے قتل کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ بظاہر دعوت میں بلایا جا رہا ہے‘ اوپر سے پتھر برسانے کی سکیم بن رہی ہے۔ طرح طرح کے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی ہے‘ جس میں غیر تو غیر کچھ اپنے بھی ملوث ہو گئے ہیں۔ یہ دو سال محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر بڑے کٹھن گزر رہے ہیں۔ اس کٹھنائی اور سختی کا نقطۂ عروج غزوۂ اَحزاب ہے۔

یہ بات ابھی تک عقدۂ لاینحل ہے کہ غزوۂ اُحد میں تقریباً فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے بعد مشرکین واپس کیوں چلے گئے! بہرحال انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ کچھ دور جا کر ہی سوچیں گے کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی‘ اور پھر پلٹنے کا خیال کریں گے۔ لہٰذا اگرچہ مسلمان زخموں سے چور چور تھے لیکن آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ کفار کا پیچھا کرو‘ ورنہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو وہ پھر لوٹیں گے۔ بہرحال جس طرح طائف کا دن رسول اللہ ﷺ کے لیے شخصی اور انفرادی سطح پر اہم ترین موڑ تھا اسی طرح غزوۂ خندق (غزوۂ اَحزاب) مسلمانوں کی جماعت کے لیے turning point تھا۔

غزوۂ اَحزاب میں مسلمانوں کے خلاف تین قوتیں مجتمع تھیں: (۱) قریش کی بھرپور طاقت۔ (۲) یہود کی مکمل طاقت جو مدینہ سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ اُنہیں اُن کی بدعہدی کی وجہ سے مدینہ سے نکال دیا گیا تھا اور اب یہ خیبر میں آباد تھے۔ (۳) ادھر سے نجد کی طرف کے قبائل یعنی اہل عرب کی پوری طاقت مجتمع ہوگئی تھی اور بارہ ہزار کے لشکر جرار نے مدینہ کو آ کر گھیر لیا تھا۔ اُس وقت کے اعتبار سے یہ بہت بڑا لشکر تھا اور عرب میں اس سے پہلے کبھی اتنا بڑا لشکر جمع نہیں ہوا تھا۔ دامنِ اُحد میں کل تین ہزار کفار آئے تھے اور اب یہ بارہ ہزار تھے۔ سورۃ الاحزاب میں اس کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱﴾

''(اے مسلمانو!) یاد کرو جب لشکر پر لشکر آ رہے تھے تمہارے اوپر سے بھی اور تمہارے نیچے سے بھی' اور جب آنکھیں (وحشت و حیرت سے) پھرنے لگیں اور (خوف و ہراس سے) دلوں کا یہ حال تھا کہ وہ گویا گلوں میں آ کر اٹک گئے ہیں اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اُس وقت اہل ایمان کی خوب آزمائش کی گئی اور وہ بری طرح ہلا ڈالے گئے۔''

مدینہ حجاز کا شہر ہے' اس کے دائیں طرف کا علاقہ اونچا ہے' جسے نجد کا علاقہ کہتے ہیں۔ ادھر سے جو لشکر آ رہے تھے اُن کے متعلق ''مِّنْ فَوْقِكُمْ'' کے الفاظ آئے۔ ساحل کی طرف ڈھلوان ہے' اُدھر سے قریش چل کر آئے تھے' ان کے متعلق ''مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ'' فرمایا کہ وہ نیچے سے آ رہے تھے۔ مزید برآں شمال سے یہود آئے اور ان سب نے مل کر مدینہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اُس وقت اہل ایمان جانچے گئے' پرکھے گئے کہ کون کتنے پانی میں ہے' اُن کے اندر واقعتاً کتنا ایمان ہے' کون جھوٹ موٹ کا عاشقِ رسول بنا ہوا تھا اور کون واقعتاً تن من دھن کی قربانی کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ ایسی خوفناک صورت حال ہوگئی تھی کہ بظاہر احوال بچنے کی کوئی صورت سامنے نہیں تھی۔ کس کس کا مقابلہ کریں گے؟ مدینہ کی چھوٹی سی بستی ہے جو لشکروں کی یلغار میں گھر گئی ہے۔ ادھر مارِ آستین بنو

قریظہ موجود ہیں جو کسی بھی وقت پیچھے سے خنجر گھونپ سکتے ہیں۔

خندق کی تیاری

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔ جس طرح غزوۂ اُحد میں مشورہ ہوا تھا' اسی پر یہاں بھی عمل ہوا۔ خندق کھودی جا رہی ہے' سنگلاخ زمین ہے' سردی کا شدید موسم ہے' کھانے کو کچھ نہیں ہے' باغات سارے دشمنوں کے قبضے میں آ چکے ہیں' چاروں طرف سے محاصرہ اور ناکہ بندی ہے۔ کھانے کو کہاں سے آئے گا؟ فاقے پر فاقہ ہے' لوگوں نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ محض محاورۃً نہیں' واقعتاً ایسا ہی ہے' تاکہ نقاہت کی وجہ سے کمر دوہری نہ ہو جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس حال میں جراُتِ مؤمنانہ اور ہمت مردانہ کے ساتھ خندق کی کھدائی کر رہے ہیں اور زبانوں پر یہ ترانہ ہے:

نَحۡنُ الَّذِیۡنَ بَایَعُوۡا مُحَمَّدًا
عَلَی الۡجِهَادِ مَا بَـقِیۡنَا اَبَدًا

''ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ ہم نے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہماری جان میں جان ہے!''

جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظ ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنَّ الۡعَیۡشَ عَیۡشُ الۡآخِرَةِ
فَاغۡفِرۡ لِلۡاَنۡصَارِ وَالۡمُهَاجِرَةِ(۱)

''اے اللہ! اصل زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے' اصل عیش تو بس آخرت کا عیش ہے! پس تو مغفرت فرما دے انصار کی بھی اور مہاجرین کی بھی!''

خندق کی کھدائی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس شریک تھے اور بھاری بھاری پتھر اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے۔ یہ نقشہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ کہیں خیمے میں گاؤ تکیہ لگائے آرام سے بیٹھے ہوں۔ آپ ﷺ بالکل عام مسلمانوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ اور جب کچھ لوگوں

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر کے متعدد ابواب۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب غزوة الاحزاب۔ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ اشعار صحیحین میں متعدد مقامات پر نقل ہوئے ہیں۔

نے آ کر اپنے کُرتے اٹھا کر دکھائے کہ حضورؐ! ہم نے فاقہ کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں‘ تو آپ ﷺ نے اپنا کرتہ اٹھا کر دکھایا کہ وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

امتحان یقیناً شدید تھا اور صورت حال انتہائی خطرناک اور مخدوش تھی۔ قرآن مجید نقل کرتا ہے کہ اس آزمائش کا نتیجہ کیا نکلا۔ جن کے دلوں میں روگ یعنی نفاق تھا‘ انہوں نے برملا کہا کہ: ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (الاحزاب) ”ہم سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے کیے تھے وہ جھوٹے نکلے“۔ انہوں نے ہمیں دھوکہ دیا اور ہمیں سبز باغ دکھا کر مروا دیا۔ ہم سے تو کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں تمہارے قدموں میں ہوں گی‘ جبکہ اس وقت ہم رفع حاجت کے لیے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ ہمارے کھانے کو کچھ نہیں‘ فاقے پر فاقے آ رہے ہیں۔

دوسری طرف جن کے دلوں میں ایمان تھا وہ اس صورت حال میں پکار اٹھے:

﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ (الاحزاب:۲۲) ”یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے‘ اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی“۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ حق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ عرب وعجم پر تمہیں غلبہ حاصل ہوگا‘ اور قرآن میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۵)

”اور ہم تمہیں لازماً آزما کر رہیں گے کسی قدر خوف و خطر سے‘ فاقہ کشی سے‘ اور جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے۔“

یہ آیات سورۃ البقرۃ کی ہیں جو غزوۂ بدر سے بھی پہلے نازل ہو چکی ہے۔ فرمایا کہ مسلمانو! ہم تمہیں آزمائیں گے‘ خوف ہوگا‘ خطرہ ہوگا‘ بھوک اور فاقہ ہوگا‘ مال کا نقصان بھی ہوگا‘ جانی ضیاع بھی ہوگا‘ کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا‘ فصلیں اُجڑیں گی‘ غرض سب کچھ ہو گا۔ اہل ایمان کی اس آیت پر نگاہ تھی‘ اس لیے کہا کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے‘ اور بالکل سچا وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے! دیکھئے

ایک ہی صورتِ حال ہے، جس کے نتیجے دو نکل رہے ہیں۔ جس طرح ایک ہی کتاب ہے قرآن مجید، مگر: ﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ﴾(البقرۃ:۲۶) ''اس سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے!'' اسی طرح ایک ہی situation ہے غزوۂ اَحزاب کی، مگر نتیجے دو نِکل رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل فیصلہ کن چیز انسان کے اندر کی کیفیت ہے۔

نصرتِ الٰہی کا ظہور

غزوۂ اَحزاب میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنی خصوصی نصرت و تائید سے نوازا اور جس قدر خوفناک صورت بنی تھی، اُسی قدر معجزانہ طور پر معاملہ ختم ہو گیا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کی تدبیر کو بھی بڑا دخل ہے، لیکن آخری فیصلہ کن چیز تائید الٰہی ہے۔ ایک شب ایسی زبردست آندھی آئی کہ کفار و مشرکین کے خیمے اکھڑ گئے، دیگیں جو چولہوں پر چڑھی ہوئی تھیں الٹ گئیں اور خیموں میں آگ لگ گئی، ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حکیمانہ اقدامات فرمائے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کفار میں پھوٹ پڑ گئی اور آپس میں بے اعتمادی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے اپنے اپنے خیمے اٹھائے اور اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر گئے اور فضا ایسے صاف ہو گئی کہ جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس غزوۂ احزاب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کا امتحان لینا تھا کہ کون کتنے پانی میں ہے، سب جان لیں کہ ان میں کون منافق ہیں اور کون وہ ہیں جو کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں! پس یہ واضح ہو گیا۔

غزوۂ خندق کے بعد نبی اکرم ﷺ نے یہ تاریخی الفاظ فرمائے: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))(۱) ''مسلمانو! اب اس سال کے بعد قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے، اب تم ان پر حملہ آور ہو گے''۔ اب پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ کفر جتنی جمعیت اور تیاری کے ساتھ اُس وقت آیا تھا اس سے زیادہ تیاری ممکن نہیں تھی۔ نبی اکرم ﷺ کو بخوبی اندازہ تھا کہ اس ناکامی کے بعد اب کفار و مشرکین میں حوصلہ نہیں کہ دوبارہ اتنے اہتمام کے ساتھ آئیں۔ یہ واقعہ ۵ ہجری کا تھا۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۳۹۶/۶۔ راوی محمد بن اسحاق۔

صلح حدیبیہ: فتح مبین

اگلے سال ۶ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے لہٰذا آپؐ نے بغرضِ عمرہ مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کرنے کا اعلان فرما دیا اور چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ ہدی کے جانور لے کر روانہ ہوئے۔ احرام بندھا ہوا ہے' تلواریں ساتھ ہیں لیکن نیاموں میں بند' کوئی اور ساز وسامان ساتھ نہیں۔ اُدھر قریش سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں! وہ آنحضور ﷺ کا راستہ روک نہیں سکتے۔ اس لیے کہ اس دوران میں یہی تو نہیں ہوا کہ آپ ﷺ بس مدینہ منورہ ہی میں کام کرتے رہے ہوں' بلکہ آس پاس دعوت پہنچ رہی ہے' قبائل میں بھی اب آپؐ کے جان نثار موجود ہیں۔ گویا اب قریش تنہا (isolate) ہو رہے ہیں۔ قریش کے نزدیک مسلمانوں کا سفرِ عمرہ ایک نوع کی چڑھائی تھی اور انہیں یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ اس طرح شکست قبول کر لیں۔ اس کے بعد تو عرب میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ تک پہنچ گئے۔ قریش کی طرف سے سلسلۂ جنبانی شروع ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ پہلے تو رعب ڈالا گیا' سفارتیں آئیں۔ ان میں عروہ بن مسعود ثقفی بہت بڑے سفیر تھے' جو بعد میں ایمان لے آئے۔ وہ یہاں آ کر تو اہل ایمان کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے' مگر وہاں جا کر انہوں نے خبر دی کہ اے قریش! میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں' لیکن محبت اور جان نثاری کا جو جذبہ میں نے محمدؐ کے ساتھیوں میں محمدؐ کے لیے دیکھا ہے وہ کہیں اور نہیں دیکھا۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ صلح کر لو۔

عروہ بن مسعود کے اس اظہارِ خیال پر مکہ میں بہت شور وغوغا ہوا' لیکن آخر کار قریش مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ گفتگو کے لیے قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو آئے (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) اور انہوں نے ایسی شرائط پر مصالحت کا عندیہ دیا جو قریش کے لیے آبرومندانہ ہوں۔ گفت وشنید کے بعد صلح نامہ طے پا گیا۔ اس معاہدہ کی بعض شرائط نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے بظاہر بڑی سبکی کا باعث اور توہین آمیز تھیں۔ قریش نے پہلی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ اس سال آپ کو بغیر عمرہ کیے واپس جانا

ہو گا' البتہ اگلے سال آپ لوگ آئیں' ہم تین دن کے لیے مکہ کو خالی کر دیں گے اور خود پہاڑوں پر چلے جائیں گے۔ معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے والی یا سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا تو مسلمان اسے واپس لوٹانے کے پابند ہوں گے' لیکن اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر ہمارے پاس آئے گا تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ نبی علیہ السلام مسکرا رہے ہیں' شرط پر شرط مان رہے ہیں' جبکہ مسلمان پیچ وتاب کھا رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟ سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اضطراب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو لاحق ہو گیا' جن کے بارے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ((اَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ))(۱) ۔ ان کے لیے یہ چیز کسی درجے میں بھی قابل قبول نہیں تھی۔ دوڑتے ہوئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا ہم حق پر نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''یقیناً ہیں''۔ کہنے لگے: ''تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے! ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں؟'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ وہی کرتے ہیں جس کا آپؐ کو حکم ہوتا ہے!'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''حضورؐ! کیا آپؐ حق پر نہیں ہیں اور کیا آپؐ اللہ کے نبی نہیں ہیں؟'' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''کیوں نہیں؟ یقیناً میں حق پر ہوں اور اللہ کا نبی ہوں!'' پھر عرض کیا: ''پھر ہم اس طرح کا معاملہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اللہ ہمارے ساتھ نہیں ہے؟'' آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: ''یقیناً اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اُس کا نبی ہوں اور میں وہی کچھ کر رہا ہوں جس کا مجھے حکم ہے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ذرا تیکھے انداز میں گفتگو کی تھی اس کا انہیں ساری عمر قلق رہا۔ بعض لوگ جن کے دلوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دشمنی اور بغض وعناد ہے' وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرزِ تخاطب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی پر محمول

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب' باب مناقب معاذ بن جبل ...... سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں الفاظ ہیں: ((وَاَشَدُّھُمْ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ عُمَرُ))

کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ تو حمیتِ حق کا جذبہ تھا جس کی بنا پر ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ اس موقع پر حمیتِ حق کے اسی جذبے کا اظہار حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ہوا تھا جو یہ معاہدہ تحریر کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ عبارت تحریر (dictate) کرائی: ''یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ اور قریش کے درمیان طے پایا'' تو سہیل بن عمرو نے فوراً اعتراض کیا کہ ''ہمیں آپ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' کے الفاظ منظور نہیں ہیں' اگر ہم آپ کو رسول اللہ مان لیتے تو جھگڑا کاہے کا تھا؟'' اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''محمدؐ رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا دو اور اس کی جگہ ''محمد بن عبداللہ'' لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے جواب میں عرض کیا کہ ''حضورؐ میں یہ کام نہیں کر سکتا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ وہ الفاظ کہاں ہیں' اور انہیں خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ پھر وہاں لکھا گیا کہ ''یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب اور قریش کے مابین طے پایا''۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کی' مگر ایسا ہرگز نہیں ہے' بلکہ وہ ''محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ لکھنے کے بعد انہیں مٹانا سوءِ ادب خیال کر رہے تھے۔

ابھی اس معاہدے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ سہیل بن عمرو کے صاحبزادے ابوجندل رضی اللہ عنہ کسی طرح وہاں آ پہنچے۔ وہ مکہ میں ایمان لا چکے تھے اور اس کی پاداش میں سہیل بن عمرو نے انہیں بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر تشریف فرما ہیں تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بیڑیاں توڑ کر چھپتے چھپاتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کیا کہ حضورؐ! مجھے اپنے ساتھ لے چلیے' انہوں نے میرا جو حشر کیا ہے وہ دیکھ لیجیے۔ سب مسلمان ان کی حالت زار کو دیکھ رہے ہیں۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ معاہدے کی شرائط کی رو سے ابوجندل کو میرے حوالے کر دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندلؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''ابوجندل! صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور دوسروں کے لیے جو ان حالات میں مظلومانہ طور پر مقید ہیں' کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا' ہم صلح کی شرائط

طے کر چکے ہیں اوران کی رو سے ہم پابند ہیں کہ تمہیں واپس کر دیں‘‘۔ چنانچہ سہیل اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ واپس لے گئے۔ اُس وقت مسلمانوں کے دلوں پر جو بیت رہی ہو گی اس کا اندازہ کر لیجیے۔

صلح حدیبیہ کے ثمرات

اس معاہدے کو قرآن مجید نے ’’فتح مبین‘‘ قرار دیا اور حدیبیہ سے واپسی پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا﴾ (الفتح) ’’(اے محمدؐ!) یقیناً ہم نے تو آپ کو کھلی فتح عطا کی ہے‘‘۔ اور وہ واقعتاً کھلی فتح ثابت ہوگئی۔ یہ معاہدہ ہر اعتبار سے رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے حق میں پڑا اور مسلمانوں کے خلاف جنگی سرگرمیاں اور جتھے بندیاں ختم ہوگئیں۔ درحقیقت اس معاہدے کا مطلب یہ تھا کہ قریش نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو ایک ’’طاقت‘‘ کی حیثیت سے تسلیم (recognize) کرلیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ اس مرحلے پر اسلام کو اپنی دعوت کی اشاعت کے لیے امن درکار تھا جو اس صلح سے حاصل ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس مسخر کرنے والی اصل قوت قرآن مجید اور اس کی دعوت تھی۔ ع ’’جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ!‘‘ تلوار دل کو فتح نہیں کیا کرتی‘ دل کو فتح کرتا ہے قرآن مجید! جب تک جنگوں کا سلسلہ چل رہا تھا ادھر کما حقہٗ توجہ نہیں ہو رہی تھی۔ اب جو موقع ملا تو بیرونی اور اندرونی دونوں سطحوں پر دعوت و تبلیغ کا عمل پوری شدت سے شروع ہوگیا۔ اصحابِ صفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی اُس میں سے پچاس کو اِدھر بھیج دیا‘ سو کو اُدھر بھیج دیا‘ ستر کو اُدھر بھیج دیا۔ اُن میں بے چارے وہ بھی تھے جن کو شہید کر دیا گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض لوگوں نے درخواست کی کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ بھیجئے جو ہمیں قرآن پڑھائیں‘ اور پھر کہیں گھاٹی میں لے جا کر انہیں شہید کر دیا۔ بئر معونہ کے واقعہ میں ستر اصحابِ صفہ میں سے شاید ایک صاحبؓ بچ سکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دعوتی عمل پوری شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ دل فتح ہو رہے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر قریش سمجھ گئے کہ ہمارے تو ہاتھ بندھ گئے۔

حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ جنہیں نبی اکرم ﷺ نے معاہدے کی رو سے واپس کر دیا تھا' کچھ دنوں کے بعد دوبارہ اپنی قید سے فرار ہوئے اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ اب مکہ سے کوئی مسلمان کفار کی اسیری سے نکل بھاگتا تھا تو وہ مدینہ کو نہیں جاتا تھا کہ اسے واپس کر دیا جائے گا' بلکہ ابوجندلؓ سے آ کر مل جاتا۔ اس طرح ان لوگوں نے اس تجارتی شاہراہ پر جو ساحلِ سمندر کے قریب سے گزرتی تھی' اپنا ٹھکانہ بنالیا اور قریش کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اس معاہدے کے پابند نہیں تھے جو قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا۔ اگر وہ مدینہ آتے تو آپؐ انہیں واپس کر دیتے۔ ان کی چھاپہ مار کارروائیوں سے تنگ آ کر قریش کا ایک وفد مدینہ آیا اور آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ معاہدہ کی اس شرط کو ہم خود واپس لیتے ہیں' اب مکہ سے جو بھی آپؐ کے پاس مدینہ آ کر آباد ہونا چاہے وہ آ سکتا ہے' ہم اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کریں گے' آپ خدا کے لیے ابوجندل اور اس کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلا لیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ بلالیا اور قریش کے قافلوں کا راستہ محفوظ و مأمون ہو گیا۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں نہ صرف جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اپنے عروج کو پہنچ گئیں' بلکہ آپ ﷺ نے پہلی مرتبہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر متعدد سلاطین کو دعوتی مکتوب ارسال فرمائے۔ اس طرح آپؐ کی دعوتی سرگرمیاں بیرونِ عرب بھی شروع ہو گئیں۔

اگلے سال ذوالقعدہ ۷ھ میں نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جم غفیر کے ہمراہ عمرۂ قضا ادا فرمایا اور طے شدہ شرائط کے مطابق تین دن تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ معنوی طور پر یہ قریش کی زبردست شکست تھی اور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ادائے عمرہ سے ان کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

صلح حدیبیہ کا خاتمہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر بنوخزاعہ نبی اکرم ﷺ کے حلیف بن گئے تھے اور ان کے

حریف بنوبکر قریش کے حلیف ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے قریباً دو سال بعد بنوبکر نے رات کی تاریکی میں بنوخزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا' جس کے نتیجے میں بنوخزاعہ کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ قریش کے سردار بھی بھیس بدل کر اس شب خون میں شریک ہوئے اور تلواریں چلائیں۔ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ کا وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور فریاد کی کہ ہمارے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے' اب صلح حدیبیہ کی رو سے آپؐ بنوبکر اور قریش سے ہمارا بدلہ لیں۔ نبی اکرم ﷺ نے قریش کے پاس سفارت بھیجی اور تین شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کر دو۔ دوسری یہ کہ اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو بنوبکر کی حمایت سے الگ ہو جاؤ۔ تیسری یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں تو اعلان کر دو کہ صلح حدیبیہ ختم ہو گئی۔ قریش کے مشتعل مزاج لوگوں نے یہ شرائط سنتے ہی فوراً کہا کہ ہمیں تو صرف تیسری شرط منظور ہے' بس آج سے صلح حدیبیہ ختم! ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں!!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس بات کے منتظر تھے کہ قریش کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہو اور آپؐ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ آپؐ نے اس موقع کو ایسی مضبوطی سے پکڑا کہ قریش پر فوراً یہ احساس طاری ہوا کہ ہم نے غلطی کی' ہم مارے گئے' صلح کی تجدید ہونی چاہیے' ہم محمد (ﷺ) کا مقابلہ نہیں کر سکتے' یہ ہم کیا کر بیٹھے؟ چنانچہ اب ابوسفیان صلح کی تجدید کی درخواست لے کر خود مدینہ پہنچے' لیکن بارگاہِ رسالت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دیکھئے! دو سال پہلے آنحضور ﷺ نے بظاہر دب کر صلح کی' مگر اب آنحضور ﷺ صلح نہیں کر رہے' کیوں؟ اس لیے کہ اب صلح کی تجدید کا مطلب کفر کو زندہ رہنے کی ایک مہلتِ تازہ (fresh lease of existence) دینا تھا' جو آنحضور ﷺ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ آپؐ دیکھ رہے تھے کہ ان کی قوت ٹوٹ چکی ہے' ان میں مزاحمت موجود نہیں' مقابلہ کر نہیں سکتے تو اب انہیں صلح کی ڈھال کاہے کو دی جائے؟ اصل مقصد تو اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ اس میں تأخیر کس لیے؟ معلوم ہوا کہ اصل مطلوب نہ صلح ہے نہ جنگ' اصل چیز تو مقصد ہے' اور وہ ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔

ابوسفیان صلح کی تجدید کی کوشش میں مدینہ منورہ آئے تو اپنی صاحب زادی اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور اُمّ المؤمنین ہیں۔ یہ بڑی امیدیں لے کر گئے ہوں گے۔ وہاں عجیب واقعہ پیش آیا' گھر میں پہنچے' اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر بچھا ہوا تھا' اس پر بیٹھنے لگے تو بیٹی نے کہا کہ ذرا ٹھہریے ابا جان! بستر لپیٹ کر کہا کہ اب تشریف رکھیے! عرب کے اس مدبر سردار نے فوراً سوال کیا کہ بیٹی! کیا یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس کے لائق نہ تھا؟ حضرت اُمِّ حبیبہؓ نے کہا: ابا جان! آپ اس بستر کے لائق نہیں ہیں' یہ بستر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور آپ مشرک ہیں' آپ اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ اب وہ کیا سفارش کرواتے؟ وہاں سے نکلے۔ مسجد نبویؐ کے پاس کچھ درویش صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے' انہوں نے ابوسفیان پر کوئی فقرہ چست کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پاس سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ان درویش صحابہؓ کو سمجھایا کہ آخر قریش کا سردار ہے' ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو بھی کچھ جواب دے دیا' آخر درویش تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابوبکرؓ! کہیں ان کو ناراض تو نہیں کر آئے؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن سے یہ ناراض ہو جائیں ان سے اللہ بھی ناراض ہو جاتا ہے!'' بہرحال ابوسفیان کی تجدیدِ صلح کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور وہ واپس لوٹ گئے۔

فتح مکہ

رمضان ۸ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کن اقدام فرمایا اور دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر کے ہمراہ مکہ کا قصد فرمایا۔ اہل مکہ میں اب مزاحمت کا حوصلہ نہیں تھا۔ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل آٹھ برس بعد فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے اور انقلاب آ گیا۔ بالکل معمولی سی جھڑپ کہیں کہیں ہوئی ہے' اس لیے کہ قریش کو معلوم تھا کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں۔ صورتِ حال یکسر تبدیل ہو چکی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار جان نثاروں کے جلو میں فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ وقت گردنوں کے اکڑنے اور سینوں کے تننے کا ہوتا ہے' مگر یہاں یہ کیفیت ہے کہ محمدؐ رسول

اللہ ﷺ کی گردن اتنی جھکی ہوئی ہے کہ جس سواری پر بیٹھے ہیں اس کی گردن سے آپؐ کی پیشانی مَس کر رہی ہے۔ اریحا شہر کی فتح کے وقت بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا: ﴿وَادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا﴾ (البقرۃ:۵۸) ''اور دروازے میں سر جھکائے ہوئے داخل ہونا''۔ یعنی فاتح کی حیثیت سے داخل ہوں تو جھک کر داخل ہوں' اُس وقت غرور نہ ہو' استکبار نہ ہو۔ یہاں عملاً یہی کیفیت ہے۔ معافی کا اعلانِ عام ہو گیا کہ جو اپنے گھر میں رہے اسے بھی معاف کیا جاتا ہے' جو خانہ کعبہ میں آ جائے اسے بھی پناہ مل گئی۔ ابوسفیانؓ اب اسلام قبول کر چکے تھے۔ اعلان کر دیا گیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اسے بھی امان حاصل ہو گئی۔ اور پھر جب سب سردارانِ قریش گردن جھکائے سامنے آئے تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا کیا گمان ہے کہ مَیں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟ ان کا جواب انتہائی خوشامدانہ تھا جو کسی عرب کی زبان پر آ سکتا ہے۔ وہ پکار اٹھے: اَخٌ کَرِیۡمٌ وَابۡنُ اَخٍ کَرِیۡمٍ یعنی آپ ایک شریف اور بامروت بھائی ہیں اور ایک شریف اور بامروت بھائی کے بیٹے ہیں۔ رحمۃٌ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ((لَا تَثۡرِیۡبَ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ)) ''آج تم پر کوئی سرزنش نہیں ہے''۔ ((اِذۡهَبُوۡا فَاَنۡتُمُ الطُّلَقَاءُ)) ''جاؤ تم سب آزاد ہو''۔[1]

غزوۂ حنین

رمضان ۸ھ میں مکہ کا فتح ہو جانا گویا محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی اندرونِ عرب کامیابی کی علامت (symbol) تھا۔ لیکن کفر کی ایک آخری کوشش اور ہوئی۔ غیر قریش عرب قبائل نے مجموعی طور پر ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ کسی طرح اس سیلاب کو روکا جائے۔ یہ ثقیف اور ہوازن کے قبائل تھے جو طائف اور اس کے اردگرد آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے بڑے جنگجو اور بڑے ماہر تیر انداز تھے۔ چنانچہ اگلے ہی مہینے شوال ۸ھ میں غزوۂ حنین پیش آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اب بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ دس ہزار مدینہ سے آئے تھے اور دو ہزار مکہ سے شامل ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ابھی ایمان نہیں

---

(۱) فقه السیرة للالبانی' ۳۸۲۔

لائے تھے مگر ساتھ شامل تھے۔ اس موقع پر بعض مسلمانوں کی زبان سے اپنی کثرت کے زعم میں یہ الفاظ نکل گئے کہ ''آج مسلمانوں پر کون غالب آ سکتا ہے!'' اللہ تعالیٰ کو یہ گھمنڈ پسند نہ آیا' لہٰذا پہلے ہی ہلے میں دشمن کی طرف سے تیروں کی ایسی بوچھاڑ آئی کہ بھگدڑ مچ گئی اور بارہ ہزار کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضورﷺ کے ساتھ صرف چار سو جان نثار باقی رہ گئے تھے۔ اس موقع پر نبی اکرمﷺ کی ذاتی شجاعت کا سب سے بڑا اظہار ہوا۔ آپﷺ سواری سے اترے' علَم ہاتھ میں لیا اور یہ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ! اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ!![۱]

''میں اللہ کا نبی ہوں (اس میں ذرّہ برابر) جھوٹ نہیں ہے' میں عبدالمطلب (جیسے بہادر) کا بیٹا ہوں!''

پھر آپﷺ نے انصار و مہاجرین کو پکارا:

((یَا اَصْحَابَ السَّمُرَةِ! یَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ! یَا بَنِی الْحَارِث))[۲]

''اے بیعت رضوان کرنے والو! اے گروہِ انصار! اے بنی الحارث!''

اللہ کے رسولﷺ کی پکار سنتے ہی انصار و مہاجرین یہ کہتے ہوئے دفعتاً پلٹ پڑے کہ: **لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَسَعْدَیْکَ ' لَبَّیْکَ نَحْنُ بَیْنَ یَدَیْکَ** پھر جو مسلمانوں نے جم کر حملہ کیا تو جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا اور وقتی شکست کامل فتح سے بدل گئی۔

قرآن حکیم میں غزوۂ حنین کا ذکر بایں الفاظ آیا ہے:

﴿...... وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ۝۲۵ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ

---

(۱) صحیح البخاری ' کتاب المغازی' باب قول اللہ تعالی : **وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ** ......و کتاب الجهاد' متعدد ابواب۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد' باب غزوة حنین۔

(۲) مسند احمد۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب غزوة الطائف۔

كَفَرُوْا ۗ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴿۲۶﴾

''......اور غزوۂ حنین کے دن کو یاد کرو جب تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ ہو گیا تھا، مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مؤمنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور کافروں کو سزا دی۔ اور یہی بدلہ ہے کافروں کا۔''

چنانچہ مؤمن کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اسباب و وسائل پر نہیں۔ ﴿اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ کی رو سے سارا ساز و سامان تیار کیا جائے، لیکن بھروسہ صرف اللہ پر ہو۔

فراستِ نبویؐ کا عظیم مظاہرہ

غزوۂ حنین میں بڑا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اس کی تقسیم کے وقت نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کو زیادہ نوازا جو فتح مکہ کے بعد نئے نئے ایمان لائے تھے، تاکہ ان کی تألیف قلب ہو، جو صدقات کی تقسیم کے ضمن میں قرآن کا بیان کردہ ایک مصرف ہے۔ لیکن منافقین نے اس معاملے کو خوب اچھالا۔ عجیب انداز میں کہا گیا کہ جب خون دینے اور جانیں دینے کا وقت آتا ہے تو ہم (انصار) یاد آتے ہیں اور اب مالِ غنیمت بانٹنے کا وقت آیا تو اپنے گھر والے، اپنے خاندان والے اور اپنے قبیلے والے یاد آ گئے۔ اس اعتبار سے تو یہ بات غلط نہیں تھی کہ اُس وقت جو مؤلفۃ القلوب تھے وہ مکہ کے لوگ تھے جو رسول اللہ ﷺ کے کنبے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے مسلمانوں میں ایک عام بے چینی پھیل گئی۔ عجیب انداز میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ آنحضور ﷺ کو بھی یہ سب خبریں پہنچ رہی تھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اس نازک اور پیچیدہ صورت حال کو جس عمدگی سے حل فرمایا وہ آپؐ کی فراست اور حسنِ تدبر کا شاہکار ہے۔ آپ ﷺ نے ایک بہت بڑا خیمہ نصب کروایا اور تمام انصارؓ کو وہاں جمع کر لیا۔ وہاں آپؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جو فصاحت و بلاغت اور فراست و ذکاوت کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کے ادراک میں بھی آپؐ کی مہارت کا شاہکار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اہل

یثرب! کیا یہ درست نہیں کہ تم گمراہ تھے' اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی؟'' انہوں نے بیک زبان کہا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! (کیوں نہیں' اے اللہ کے رسول!) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے گروہِ انصار! کیا یہ درست نہیں کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے' اللہ نے میرے ذریعے تمہارے دلوں میں محبت پیدا کر دی؟'' انہوں نے پھر کہا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! ظاہر ہے کہ ان باتوں کا تو انکار ممکن ہی نہیں۔ آپ ﷺ نے وہ سارے احسانات گنوائے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی وساطت سے انصار پر کیے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے خطاب کا رُخ بدلا اور فرمایا: ''اے اہل یثرب! تم جواب میں یہ کہہ سکتے ہو کہ اے محمد (ﷺ) جب آپؐ کی قوم نے آپؐ کو جھٹلا دیا تو ہم آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کی تصدیق کی۔ میں جواب میں کہوں گا کہ تم صحیح کہتے ہو''۔ پھر فرمایا: ''تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جب آپؐ کے دشمنوں نے آپؐ کو ہجرت پر مجبور کر دیا اور آپؐ کو کوئی پناہ دینے والا نہیں تھا تو ہم نے آپؐ کو پناہ دی اور اپنے اہل وعیال سے بڑھ کر آپؐ کی حفاظت کی۔ تو میں کہوں گا تم درست کہتے ہو۔ تو اے معشرِ انصار! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ بھیڑیں' بکریاں اور اونٹ لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) کو لے کر اپنے گھروں کو واپس لوٹو؟'' اس پر شدتِ جذبات سے تمام انصار کی چیخیں نکل گئیں اور سب پکار اٹھے: ''رَضِیْنَا' رَضِیْنَا'' (ہم راضی ہیں' ہم راضی ہیں!) یعنی ہمیں نہ اونٹ چاہئیں اور نہ بھیڑ بکریاں' ہمیں تو صرف اللہ کے رسول محمد ﷺ درکار ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے انصار کے سامنے یہ حکمت بیان فرمائی کہ مکہ کے لوگ تازہ ایمان لائے ہیں' ان کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ کسی ناحق جانبداری کی بنا پر نہیں' بلکہ تألیفِ قلب کے لیے دیا گیا ہے۔(۱)

بہرحال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی انقلابی جدوجہد کی راہ میں جتنی مشکلات اور رکاوٹیں آ سکتی ہیں وہ ہمیں آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں بتمام وکمال نظر آتی

---

(۱) صحیح البخاری ' کتاب المغازی' باب غزوۃ الطائف ...... وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب اعطاء المؤلفۃ قلوبھم ...... (اس واقعہ کی تفاصیل مختلف احادیث میں آئی ہیں۔)

ہیں۔ بار ہا آپ ﷺ کو پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ ایک ایک قدم پر کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا۔

مشرکین عرب کو آخری تنبیہہ

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کا تدبر ملاحظہ کیجیے کہ پہلا حج جو آیا وہ آپؐ نے مشرکین کے زیر اہتمام رہنے دیا۔ مسلمانوں اور مشرکین نے مل کر اپنے اپنے طریقے سے حج کیا۔ لیکن اگلے سال آپ ﷺ نے مشرکین کے ہاتھ سے انتظام لے لیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ مدینہ سے قافلہ آیا لیکن نبی اکرم ﷺ خود تشریف نہیں لائے۔ اس حج میں بھی مشرکین کی شرکت کی اجازت برقرار رکھی گئی۔ حج کے لیے قافلہ روانہ ہو چکا تھا کہ چند دنوں بعد سورۃ التوبۃ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں مشرکین سے اعلانِ براءت ہے اور انہیں صرف اَشْھُرِ حُرُم کی مہلت دی جا رہی ہے کہ اس چار ماہ کے عرصے میں ایمان لے آئیں تو عافیت ہے' اگر اپنے شرک و کفر پر اڑے رہیں تو پھر اُن کا قتل عام شروع ہو جائے گا۔ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ جس قوم پر رسول کی بعثت کی حجت قائم ہو چکی ہو اور وہ انکار کر دے تو اس کے لیے رعایت نہیں برتی جاتی۔ چنانچہ جس ضابطے کے تحت قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ وغیرہ ہلاک کی گئیں وہی ضابطہ اب اہل عرب پر لاگو ہو رہا تھا۔ سورۃ المزمل میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّـآ اَرۡسَلۡنَـآ اِلَـیۡکُمۡ رَسُوۡلًا شَاهِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَآ اَرۡسَلۡنَـآ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰی فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ فَاَخَذۡنٰـهُ اَخۡذًا وَّبِیۡلًا ﴿۱۶﴾﴾

''تم لوگوں کی طرف ہم نے اُسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ (پھر دیکھ لو جب) فرعون نے اُس رسول کی بات نہ مانی تو ہم نے اس کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔''

تو اگر آلِ فرعون غرق کیے گئے تو تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔ تم یا تو ایمان لے آؤ یا پھر تم پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برس کر رہے گا۔ عذابِ خداوندی کی صورتیں بدل سکتی ہیں۔ کبھی وہ زمین پر زلزلے کی شکل میں آ سکتا ہے' کبھی وہ آسمان سے بارش اور طوفان

کی صورت میں آ سکتا ہے اور کبھی مسلمانوں کی تلواروں کی صورت میں آ سکتا ہے۔ سورۃ التوبۃ کی ان آیات میں مشرکین عرب کو اس عذاب سے خبردار کر دیا گیا اور پانچویں آیت میں ان کے لیے دوٹوک انداز میں عذابِ استیصال کا اعلان کر دیا گیا۔ فرمایا:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵﴾

''پس جب حرمت والے مہینے ختم ہو جائیں تو قتل کرو ان مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ' اور ان کو پکڑو' ان کا محاصرہ کرو اور ان کی خوب خبر لینے کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کریں (یعنی ایمان لے آئیں) اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو اِن کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا رحم فرمانے والا ہے''۔

ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس ہدایت کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا کہ حج کے موقع پر میدانِ عرفات میں کھڑے ہو کر آپ ﷺ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے یہ آیات حاضرین کو سنا دیں تا کہ تمام اہل عرب کو معلوم ہو جائے کہ اشہر حرم کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے مشرکین عرب کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا!

انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل

سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات میں درحقیقت عرب سے شرک کے مکمل خاتمے اور قلع قمع (mopping-up operation) کا اعلانِ عام ہے کہ اب مشرکین کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے۔ چنانچہ ان چار ماہ کے دوران تمام مشرک ایمان لے آئے اور اسلام کے خلاف مزاحم قوتوں کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا۔ اس کیفیت کو قرآن حکیم میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾ (النصر)

''جب پہنچ چکی اللہ کی مدد اور (حاصل ہو گئی) فتح۔ تو تم نے دیکھا لوگوں کو اللہ کے

دین میں داخل ہوتے فوج درفوج۔‘‘

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو تارکِ وطن ہو کر چلے گئے۔ ابوجہل کے صاحب زادے عکرمہ بھی ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور مکہ چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن عجیب واقعہ ہوا۔ حبشہ کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں طوفان آ گیا۔ جس کشتی میں سوار تھے وہ ڈولنے لگی۔ اس پر سب لوگوں نے اللہ کو پکارنا شروع کیا۔ وہ خود کہتے ہیں مَیں نے سوچا کہ اسی کی دعوت تو محمد (ﷺ) دیتے ہیں! اِس وقت کسی لات، کسی ہبل، کسی عزّیٰ کو کوئی نہیں پکار رہا، خطرے کے وقت پکارا ہے تو سب نے ایک اللہ کو پکارا ہے۔ لٰہذا واپس آئے اور ایمان لے آئے۔ بہرحال اس ایک سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب سے شرک اور کفر کا مکمل صفایا ہو گیا۔

حجۃ الوداع

اگلے سال ۱۰ ھ میں نبی اکرم ﷺ نے فریضۂ حج ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد یہی آپ ؐ کا پہلا اور آخری حج ہے۔ اسی لیے اسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس حج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنا مشن اُمت کے سپرد فرما دیا۔ سورۃ المائدۃ کی یہ آیت بھی اسی موقع پر نازل ہوئی:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾ (آیت ۳)

’’آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند فرمایا۔‘‘

اس موقع پر سرزمین عرب سے جمع ہونے والے سوا لاکھ مسلمانوں کا مجمع موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے نہایت جامع خطبہ ارشاد فرمایا اور آخر میں لوگوں سے سوال کیا: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) ’’لوگو! کیا میں نے پہنچا دیا؟‘‘ پورے مجمع نے اقرار کیا: **اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ** ’’ہم گواہ ہیں کہ آپ ؐ نے حق تبلیغ بھی ادا کر دیا، حق نصیحت بھی ادا کر دیا، حق امانت بھی ادا کر دیا‘‘۔ حاضرین سے تین مرتبہ یہ اقرار لینے کے بعد آنحضور ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ، اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ،

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ))(۱) ''اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ' اے اللہ تو بھی گواہ رہ!'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))(۲) یعنی اب وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں' ان کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کو ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں!

حجۃ الوداع کے بعد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے کل ۸۰ دن بنتے ہیں' جس کے بعد آپؐ نے رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت فرمائی۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دونوں کام پورے ہو گئے۔ اہل عرب تک تبلیغ کا حق بھی ادا ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دین اسلام کا غلبہ بھی ہو گیا۔ از روئے: ﴿لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ اس طرح محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے فرضِ منصبی کا ایک مرحلہ (phase) تکمیل کو پہنچا۔ لیکن آپؐ صرف عرب کے لیے رسول بن کر نہیں آئے تھے' آپؐ کی بعثت تو تمام نوعِ انسانی کے لیے تھی۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸) اور: ﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانبیاء) چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اپنی دعوت کے بین الاقوامی یا عالمی پہلو کا بھی آغاز فرما دیا۔ بعثتِ نبویؐ کا یہ بین الاقوامی پہلو اِن شاء اللہ آئندہ نشست میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مدنی دَور جُہدِ مسلسل کی بھرپور داستان ہے۔ اس ایک نشست میں ہم اس کا محض طائرانہ جائزہ ہی لے سکے ہیں اور اس دور کے بعض اہم واقعات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں۔ oo

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

(مرتب: حافظ خالد محمود خضر)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الحج' باب حجۃ النبی ﷺ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبۃ ایام منی۔

مسجدِ اقصیٰ کی تاریخی اہمیت

انجینئر نوید احمد

مسجد اقصیٰ کے حوالے سے ایک غلط فہمی ہے جو اکثر و بیشتر تحریر و تقریر میں نظر آتی ہے۔ عام طور پر اِسے قبلہ اوّل کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ مسجدِ حرام قبلہ اوّل ہے اور اب قیامت تک یہی قبلہ رہے گا۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے مسجد اقصیٰ کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آزمائش کے لیے قبلہ کی حیثیت دی تھی۔ پھر تحویلِ قبلہ کے حکم کے ذریعہ دوبارہ مسجدِ حرام کو قبلہ بنا دیا گیا۔ مسجدِ حرام کے قبلہ اوّل ہونے کا ذکر قرآنِ حکیم اور حدیث نبوی ﷺ دونوں میں ہے۔ سورۂ آل عمران آیت ۹۶ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ﴾(آل عمران)

''بے شک پہلا گھر جو مقرر کیا گیا لوگوں (کی عبادت) کے لیے یقیناً وہ مکہ میں ہے''۔

صحیح بخاری میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

عَنۡ اَبِی ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قُلۡتُ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ اَیُّ مَسۡجِدٍ وُضِعَ اَوَّلَ؟ قَالَ: ((اَلۡمَسۡجِدُ الۡحَرَامُ)) قُلۡتُ ثُمّ اَیٌّ؟ قَالَ: ((ثُمَّ الۡمَسۡجِدُ الۡاَقۡصٰی)) قُلۡتُ کَمۡ کَانَ بَیۡنَھُمَا؟ قَالَ: ((اَرۡبَعُوۡنَ)) ثُمَّ قَالَ: ((حَیۡثُمَا اَدۡرَکَتۡکَ الصَّلَاۃُ فَصَلِّ وَالۡاَرۡضُ لَکَ مَسۡجِدٌ))(۱)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اِس روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر ہوئی؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ''مسجدِ حرام''۔ میں نے پوچھا اِس کے بعد؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''مسجدِ اقصیٰ''۔ میں نے کہا اِن دونوں کی تعمیر کے دوران کل کتنا وقفہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''چالیس سال''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہیں جہاں نماز پڑھنا نصیب ہو پڑھ لو' تمہارے

☆ اکیڈمک ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کراچی

لیے ساری زمین مسجد ہے''۔

نسائی شریف کی شرح میں امام السندی نے اِس حدیث کی وضاحت میں تحریر کیا ہے کہ:

ليس المراد بناء ابراهيم للمسجد الحرام وبناء سليمان للمسجد الأقصٰى فان بينهما مدة طويلة بلا ريب بل المراد بناؤهما قبل هذين البنائين

''اس سے مراد مسجدِ حرام کی وہ تعمیر نہیں ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی اور نہ مسجدِ اقصٰی کی وہ تعمیر جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی' اِن تعمیرات کے درمیان تو بڑی طویل مدت ہے' بلکہ یہاں اِن تعمیرات سے قبل کی تعمیرات کا ذکر ہے''۔

گویا انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہی دونوں مساجد تعمیر کی گئیں اور اکثر اہلِ علم کی رائے ہے کہ یہ دونوں مساجد حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر فرمائیں۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((بَعَثَ اللّٰهُ جِبْرِيْلَ اِلٰى آدَمَ وَ حَوَّاءَ فَاَمَرَ هُمَا بِبِنَاءِ الْكَعْبَةِ فَبَنَاهُ آدَمُ ' ثُمَّ اَمَرَ بِالطَّوَافِ بِهٖ وَ قِيْلَ لَهٗ : اَنْتَ اَوَّلُ النَّاسِ وَ هٰذَا اَوَّلُ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ)) (۲)

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حضرت آدم علیہ السلام و بی بی حوا سلامٌ علیہا کی طرف بھیجا اور اُن کو بیت اللہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ پس حضرت آدمؑ نے اُسے تعمیر کیا۔ پھر اللہ نے اُنہیں طواف کرنے حکم دیا اور اُن سے کہا گیا کہ آپ پہلے انسان ہیں اور یہ پہلا گھر ہے جو کہ لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے''۔

ابنِ ہشام نے اپنی کتاب ''التیجان'' میں نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جب بیت اللہ کو تعمیر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف جائیں اور اُس کی بنیاد رکھیں' تو اُنہوں نے جا کر اُس کو تعمیر کیا۔

قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر اِن دونوں مقامات اور اِن سے ملحق سرزمین کے تقدس کا ذکر کیا گیا۔ مسجدِ حرام یا بیت اللہ کی حرمت یوں بیان کی گئی:

﴿**جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ**﴾ (المائدۃ: ۹۷)

''اللہ نے بنا دیا ہے اِس کعبہ کو حرمت والا گھر اور لوگوں کی بقا کا ذریعہ''۔

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اُس کے پاسباں ہیں' وہ ہے پاسباں ہمارا!

﴿**اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَـلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۹۶ فِيْهِ**

اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٧﴾ (آلِ عمران)

''بے شک پہلا گھر جو کہ مقرر کیا گیا لوگوں (کی عبادت) کے لیے وہ یقیناً مکہ میں ہے' برکت والا اور (وہ ذریعہٗ) ہدایت ہے تمام جہان والوں کے لیے۔ اِس میں بڑی واضح نشانیاں ہیں اور مقامِ ابراہیم (ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ) ہے' اور جو کوئی بھی اِس (گھر) میں داخل ہوگیا وہ آ گیا امن میں' اور اللہ کے لیے لوگوں پر (فرض) ہے اِس گھر کا حج کرنا جو کوئی بھی استطاعت رکھتا ہو اِس کی طرف راستہ (اختیار کرنے) کی' اور جس کسی نے کفر کیا (استطاعت کے باوجود حج نہیں کیا) تو بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہے''۔

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿١٢٥﴾﴾ (البقرة)

''اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) جس مقام پر ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے اُس کو نماز کی جگہ بنالو' اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو''۔

﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْـــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾﴾ (الحج)

''اور جب ہم نے ابراہیمؑ کو آباد کیا خانہ کعبہ کے پاس (اور اُنہیں حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو صاف رکھنا''۔

مسجدِ اقصیٰ سے ملحق سرزمین کی برکتوں کا ذکر اس طرح کیا گیا:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِىْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾﴾ (المائدة)

''(حضرت موسیٰؑ نے فرمایا) اے میری قوم کے لوگو ! داخل ہو جاؤ اِس مقدس

سرزمین (فلسطین) میں کہ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ نہ پھیرنا ورنہ تم ہو جاؤ گے خسارہ پانے والوں میں سے''۔

﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝۸۱﴾ (الانبیاء)

''اور ہم نے مسخر کر دی تھی سلیمانؑ کے لیے تیز ہوا جو چلتی تھی اُن کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف کہ جس میں ہم نے برکت رکھی تھی' اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے''۔

﴿وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ﴾ (الاعراف: ۱۳۷)

''اور ہم نے وارث بنا دیا اُن (بنی اسرائیل) کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اُس سرزمین (فلسطین) کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت دی تھی''۔

اِس آیتِ مبارکہ میں بنی اسرائیل کی اُس عظیم سلطنت کی طرف اشارہ ہے جو ۱۰۲۰ ق م میں حضرت طالوت نے فلسطین اور اُس کے گرد و نواح میں قائم کی اور پھر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دَور میں اپنے عروج کو پہنچی۔ سورۂ سبا آیت ۱۸ میں ارشاد ہوا:

﴿ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ﴾

''اور ہم نے اُن (قومِ سبا) کے اور (فلسطین کی) اُن بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی' (ایک دوسرے کے متصل) دیہات بنائے تھے جو سامنے نظر آتے تھے اور اُن میں آمد و رفت کا اندازہ مقرر کر دیا تھا''۔

اِس آیتِ مبارکہ کے لفظ ''القرٰی'' سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ برکت صرف فلسطین کی بستی میں نہیں رکھی گئی بلکہ اُن تمام بستیوں میں رکھی گئی ہے جو کہ اِس سرزمین سے ملحق تھیں۔

مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصٰی اور اِن سے ملحق مقامات کی یہی اہمیت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اِن دونوں مقامات کو دعوتِ توحید کے مراکز بنا دیا۔ جب اُن کی قوم اُن کی جان کی دشمن ہوئی تو اللہ نے اُنہیں بیت المقدس کی طرف ہجرت کروائی:

﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝۷۱﴾ (الانبیاء)

''اور ہم نے بچا لیا اُن (ابراہیمؑ) کو اور لوطؑ کو بھی ایک ایسی سرزمین (فلسطین) کی

طرف جس میں ہم نے برکت رکھی تھی تمام جہان والوں کے لیے''۔

اِس آیتِ مبارکہ میں وارد لفظ ''العالمین'' سے واضح ہوتا ہے کہ سرزمینِ فلسطین کی برکات تمام جہان والوں کے لیے ہیں۔ یہودیوں کا یہ خیال باطل ہے کہ اِس سرزمین کی برکات صرف اُن ہی کے استفادے کے لیے ہیں۔ ہجرت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعوتِ توحید کا ایک مرکز اِس سرزمین کو بنایا۔ اُن کے چھوٹے صاحبزادے حضرت اسحاق علیہ السلام اور پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کا مسکن یہی مقدس سرزمین تھی۔ اِسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مسجدِ حرام کے پاس شہر مکہ میں آباد فرمایا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۳۷ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے ضمن میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ﴾

''اے ہمارے ربّ! بے شک میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو لا بسایا ایک ایسی بنجر وادی میں جہاں کوئی کھیتی نہیں تیرے عزت والے گھر کے پاس''۔

اِن مساجد کی ابتدائی تعمیر حوادثِ زمانہ کی وجہ سے منہدم ہوگئی۔ مسجدِ حرام کو اُس کی سابقہ بنیادوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوبارہ تعمیر کیا جن کا دَور ایک اندازے کے مطابق ۱۸۶۱ ق م کا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط﴾ (البقرۃ: ۱۲۷)

''اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیمؑ بنیادیں اللہ کے گھر کی اور اُن کے ساتھ اسماعیلؑ''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تمام انبیاء کرام بشمول انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ مسجدِ حرام رہا، وہ اِس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے اور اِسی کا حج کرتے تھے۔ مسجدِ اقصیٰ کو دوبارہ حضرت سلیمان علیہ السلام (جن کا زمانہ ۹۶۵ ق م کا ہے) نے تعمیر کیا اور اِس کے بعد یہود نے اِس مسجد کو قبلہ بنالیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب مسجدِ حرام یا بیت اللہ کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کی آواز لگائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ﴿۲۷﴾﴾ (الحج)

''اور (اے ابراہیمؑ) لوگوں میں حج کا اعلانِ عام کرو، وہ تیرے پاس آئیں گے پیدل

اور دبلے اونٹوں پر اور ہر دُور کے راستے سے آئیں گے‘‘۔

اِس آیت میں ’’الناس‘‘ کا ذکر ہے جس میں بنو اسرائیل اور اُن کے تمام انبیاء بھی شامل ہیں۔اب اگر بنو اسرائیل کے آباء واجداد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا قبلہ بیت اللہ ہی تھا تو اُن کے بعد آنے والی نسلوں کا قبلہ تبدیل کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ بنو اسرائیل اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے دین پر تھے۔جب حضرت یعقوب علیہ السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا تو اُن کی اولاد یعنی بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس کیسے ہوسکتا ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو (جن کا دور ۱۴۳۶ ق م کا ہے) اللہ نے حکم دیا:

﴿وَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (یونس: ۸۷)

’’اور ہم نے موسیٰ اور اُن کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لیے مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ رُخ کرو اور قائم کرو نماز‘‘۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں وہ قبلہ کون سا تھا جس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا؟ بلاشبہ وہ مسجد حرام ہی تھا۔امام طبریؒ نے اِس آیت مبارکہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ: ’’وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً کے حکم میں قبلہ سے مراد ’کعبۃ‘ ہے‘‘۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور ہی میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خوشخبری دی کہ اگر وہ بیت المقدس میں آباد عمالقہ نامی قوم کے خلاف قتال کریں تو اللہ اُن کو فتح دے گا:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝٢١﴾ (المائدۃ)

’’(حضرت موسیٰ نے فرمایا) اے میری قوم کے لوگو !داخل ہو جاؤ اِس مقدس سرزمین (فلسطین) میں کہ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور پیٹھ نہ پھیرنا ورنہ تم ہو جاؤ گے خسارہ پانے والوں میں سے‘‘۔

قوم نے اِس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا اور قتال کرنے سے صاف انکار کر دیا اور بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝٢٤﴾ (المائدۃ: ۲۴)

’’(وہ بولے کہ اے موسیٰ !) تم اور تمہارا ربّ جاؤ اور لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے‘‘۔

سورۃ المائدۃ آیت ۲۵ میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کی بزدلی پر ناراض ہوکر فریاد کی:

﴿رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴿۲۵﴾﴾

''اے میرے ربّ ! بے شک میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا' پس تو ہم میں اور اِس نافرمان قوم میں جدائی کر دے''۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

﴿فَاِنَّھَا مُحَرَّمَۃٌ عَلَیْھِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً ج یَتِیْھُوْنَ فِی الْاَرْضِ ط فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴿۲۶﴾﴾ (المائدۃ)

''(اللہ نے فرمایا کہ) وہ سرزمین اُن پر چالیس برس تک کے لیے حرام کر دی گئی' بھٹکتے پھریں گے زمین میں' پھر اِن نافرمان لوگوں کے حال پر افسوس نہ کرنا''۔

چالیس سال تک صحرا میں بھٹکنے کے دوران ایک نئی نسل صحرا میں پل کر جوان ہوئی۔ اِس نسل پر فرعون کی غلامی کے اثرات نہیں تھے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا ہے: ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

صحرا میں پرورش پانے والی اِس نسل نے اُس وقت کے نبی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کیا اور ارضِ مقدس پر فتح حاصل کی۔ یہ فتح عارضی ثابت ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد محکوم قوم یعنی عمالقہ دوبارہ غالب آ گئی اور اُس نے اسرائیلیوں کو ارضِ مقدس سے نکال باہر کیا۔ اِس کے بعد حضرت طالوت کی قیادت میں بنی اسرائیل دوبارہ منظّم ہوئے اور ۱۰۲۰ ق م میں اُنہوں نے ارضِ مقدس پر فتح حاصل کر کے مستحکم حکومت قائم کی۔ ۱۶ سال حضرت طالوت خلیفہ رہے' پھر ۴۰ سال حضرت داؤد علیہ السلام کی خلافت رہی اور اِس کے بعد ۴۰ سال تک حضرت سلیمان علیہ السلام خلیفہ رہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام (جن کا دور ۹۶۵ ق م کا ہے) نے ارضِ مقدس میں ایک مسجد بنائی جسے ہیکلِ سلیمانی کہا جاتا ہے۔ ارشاداتِ نبوی ﷺ ہیں:

((اِنَّ دَاوٗدَ ابْتَدَاَ بِبِنَاءِ الْبَیْتِ الْمَقْدِسِ ثُمَّ اَوْحَی اللّٰہُ اِلَیْہِ اِنِّیْ لَاَقْضِیْ بِنَائَہٗ عَلٰی یَدِ سُلَیْمَانَ))[۳]

''حضرت داوٗدؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کے لیے بنیادیں رکھیں' پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی کی کہ میں مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں مکمل کرواؤں گا''۔

((اَنَّ سُلَيْمَانَ بْنَ دَاوٗدَ لَمَّا بَنٰى بَيْتَ الْمَقْدِسِ سَأَلَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ خِلَالًا ثَلَاثَةً: سَأَلَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ حُكْمًا يُّصَادِفُ حُكْمَهٗ فَأُوْتِيَهٗ وَسَأَلَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِهٖ فَأُوْتِيَهٗ وَسَاَلَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ حِيْنَ فَرَغَ مِنْ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ اَنْ لَّا يَاْتِيَهٗ اَحَدٌ لَّا يَنْهَزُهٗ اِلَّا الصَّلَاةُ فِيْهِ اَنْ يُّخْرِجَهٗ مِنْ خَطِيْئَتِهٖ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ))(٤)

''حضرت سلیمانؑ بن داوٗدؑ نے جب بیت المقدس کی تعمیر مکمل کر لی تو اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی دعا کی۔ اُنہوں نے اللہ سے ایسا فیصلہ کرنے کی توفیق مانگی جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ پس اُن کی دعا پوری کی گئی۔ اُنہوں نے اللہ سے ایسی حکومت کا سوال کیا جو اُن کے بعد کسی اور کو عطا نہ ہو۔ پس اُن کا سوال پورا کیا گیا۔ جب وہ مسجد بنا کر فارغ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ جب بھی کوئی شخص اِس مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے آئے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو کر نکلے جیسے کہ اُس کی ماں نے اُسے جنا ہو''۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنو اسرائیل کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی اور اُن کی ریاست دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ شمالی ریاست اسرائیل کہلائی جسے ۷۰۰ ق م میں آشوریوں نے تباہ کر دیا اور جنوبی ریاست یہودا کہلائی جس پر ۵۸۷ ق م میں بابل کے حکمران بخت نصر نے حملہ کیا۔ اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی قائم کردہ مسجد کو شہید کر دیا' پورے شہر کو اُجاڑ دیا' چھ لاکھ اسرائیلیوں کو قتل کیا اور چھ لاکھ کو قیدی بنا کر بابل لے گیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝﴾ (بنی اسراء یل)

''اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا کہ تم زمین میں دو دفعہ فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی کرو گے۔ پس جب پہلے (وعدے) کا وقت آیا تو ہم نے اپنے سخت لڑائی لڑنے والے بندے تم پر مسلط کر دیے اور وہ شہروں کے اندر پھیل گئے' اور وہ وعدہ پورا ہو کر رہا''۔

حضرت عزیر علیہ السلام جو اُس وقت کے نبی تھے، شہر سے باہر تھے۔ اُنہوں نے واپس آ کر اُجڑے ہوئے شہر کو دیکھا تو حیران ہوئے کہ جس شہر کے بارے میں مستقبل کی پیشینگوئیاں اُن کے علم میں ہیں، یہ شہر دوبارہ کیسے آباد ہوگا؟ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا :

﴿اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَاۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَاۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًاؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾﴾

''یا اُس شخص کی طرح جس کا گزر ہوا ایک ایسی بستی پر جو گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر۔ اُس نے کہا کہ اللہ اِس بستی کو مرنے (یعنی تباہ ہونے) کے بعد کیسے زندہ (یعنی آباد) کرے گا؟ تو اللہ نے اُسے موت دے دی سو برس تک کے لیے، پھر اُسے زندہ کیا۔ پوچھا تم کتنا عرصہ رہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ایک دن یا اُس سے بھی کم۔ فرمایا (اللہ نے) بلکہ تم سو برس رہے ہو۔ پس دیکھو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو وہ خراب تک نہیں ہوئیں اور دیکھو اپنے گدھے کو (جو مرا پڑا ہے) اور ہم تمہیں تمام لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کی) ایک نشانی بنا دیں گے اور دیکھو (گدھے کی) ہڈیوں کو کہ ہم اُن کو کیسے جوڑ دیتے ہیں اور اُن پر گوشت پوست چڑھا دیتے ہیں۔ جب یہ واقعات اُن کے مشاہدے میں آئے تو وہ بول اُٹھے میں جان گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے ۱۰۰ سال کا یہ تجربہ پورا کیا اور دوسری طرف ایران کے بادشاہ ذوالقرنین نے بابل پر حملہ کر کے اسرائیلیوں کو آزاد کرا دیا۔ اب اُن کے قافلے دوبارہ بیت المقدس آنا شروع ہوئے اور حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی مساعی کے ذریعہ اُن میں پھر سے ایمان اور یقین کی شمعیں روشن ہوئیں اور سیرت و کردار کی اصلاح ہوئی۔ کچھ عرصہ یونانیوں کے ساتھ اسرائیلیوں کی معرکہ آرائی رہی اور آخر کار وہ ۱۵۷ ق م میں دوبارہ ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جس کا نام مکابی سلطنت تھا۔ اب اُنہوں نے دوبارہ ہیکلِ سلیمانی کے نام سے ایک مسجد تعمیر کر لی۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۶ میں اِس کا ذکر یوں کیا گیا:

﴿ثُمَّ رَدَدۡنَا لَكُمُ الۡكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا ﴿۶﴾﴾

''پھر ہم نے دوسری بار تم کو اُن پر غلبہ دیا اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کی اور تمہیں کر دیا کثیر افرادی قوت والا''۔

حضرت مریم سلامُ علیہا کی پرورش اِسی ہیکلِ سلیمانی میں ہوئی اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش بھی یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقام عیسائیوں کے لیے بھی تقدس کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جب بعثت ہوئی تو اسرائیلیوں یعنی یہودیوں نے اُن پر دو بہتان لگائے۔ پہلا یہ کہ وہ بغیر والد کے پیدا نہیں ہوئے بلکہ معاذ اللہ ولد الزنا ہیں۔ دوسرا یہ کہ اُن کے پیش کردہ معجزات دراصل جادو ہیں۔ جادو کرنا ارتداد ہے اور شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ اُنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مرتد قرار دے کر مصلوب کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ نے اُن کو آسمان پر اٹھالیا۔ سورۂ نساء آیات ۱۵۷ اور ۱۵۸ میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰـكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ لَفِىۡ شَكٍّ مِّنۡهُ ؕ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ‌ ۚ وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا ۙ‏ ﴿۱۵۷﴾ بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ ‌ؕ﴾

''اور اُنہوں نے اُن (عیسیٰؑ) کو قتل نہیں کیا اور نہ اُنہیں صلیب پر لٹکایا بلکہ اُن کے لیے یہ معاملہ مشکوک کر دیا گیا' اور جو لوگ اِس معاملہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ اس بارے میں شک میں ہیں۔ اُن کے پاس کوئی علم نہیں سوائے گمان کی پیروی کے' اور اُنہوں نے عیسیٰؑ کو یقیناً قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ نے اُن کو اپنی طرف اٹھا لیا''۔

اب یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار اور اُن پر بہتان طرازی کی سزا اِس طرح ملی کہ رومی جرنیل ٹائٹس نے ۷۰ء میں بیت المقدس پر حملہ کر کے ایک بار پھر ہیکل کو شہید کر دیا۔ ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودی مار دیے اور بقیہ کو بیت المقدس سے نکال کر شہرِ مقدس میں ان کے داخلہ پر پابندی لگادی۔ سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۷) میں اِس کا ذکر اِس طرح ہوا:

﴿اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ‌ۖ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا ‌ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُوۡٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ﴿۷﴾﴾

''اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے ہی لیے کرو گے اور اگر برے اعمال کرو گے تو (اُن کا) وبال بھی تمہاری ہی جانوں پر ہو گا۔ پھر جب دوسرے (وعدے) کا وقت آیا (تو ہم نے پھر اپنے بندے بھیجے) تاکہ تمہارے چہروں کو بگاڑ دیں اور جس طرح پہلی دفعہ مسجد (ہیکل) میں داخل ہو گئے تھے اُسی طرح پھر اُس میں داخل ہو جائیں اور جس چیز پر غلبہ پائیں اُسے تباہ کر دیں''۔

یہ یہودیوں کا دورِ انتشار (Diaspora) کہلاتا ہے جس میں یہ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل جانے پر مجبور ہو گئے۔

۳۱۳ء میں رومن ایمپائر نے بحیثیت مجموعی عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اب اُنہوں نے بیت المقدس کے مشرقی حصے میں جہاں حضرت مریم سلامٌ علیہا نے سکونت اختیار کی تھی، اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر لیں۔

۶۱۰ء میں نبی کریم ﷺ پر ظہورِ نبوت ہوا اور دس سال بعد یعنی ۶۲۰ء میں آپ ﷺ نے سفرِ معراج کے دوران مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سفر کیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱﴾﴾

(بنی اسراء یل)

''وہ (اللہ) پاک ہے جو لے گیا ایک ہی رات میں اپنے بندے (محمد ﷺ) کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اُس (بندے) کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سب سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے''۔

معراج کے معنی ہوتے ہیں عروج حاصل کرنا۔ آپ ﷺ کے لیے اصل معراج تو تھا آسمانوں کی طرف جانا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرنا، لیکن اِس سے قبل آپ ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں آپ ﷺ نے تمام انبیاء کی ارواح سے ملاقات کی اور دو رکعات نماز میں اُن کی امامت کی۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَقَدْ رَاَیْتُنِیْ فِیْ جَمَاعَةٍ مِّنَ الْاَنْبِیَاءِ، فَاِذَا مُوْسٰی علیہ السلام قَائِمٌ یُّصَلِّیْ، فَاِذَا رَجُلٌ ضَرْبٌ جَعْدٌ کَاَنَّهٗ مِنْ رِجَالِ شَنُوْئَةَ، وَاِذَا عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ علیہ السلام قَائِمٌ یُّصَلِّیْ اَقْرَبُ النَّاسِ بِهٖ شَبَهًا عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ الثَّقَفِیُّ، وَاِذَا

اِبْرَاهِیْمُ ؑ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ اَشْبَهُ النَّاسِ بِهٖ صَاحِبُکُمْ یَعْنِیْ نَفْسَهٗ فَحَانَتِ الصَّلَاةُ فَاَمَمْتُهُمْ)) (۵)

''میں نے اپنے آپ کو (شب معراج) انبیاءؑ کی جماعت کے اندر پایا۔ میں نے دفعتاً دیکھا کہ موسیٰ ؑ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں نے دیکھا موسیٰ ؑ ایک مرد ہیں متوسط قد کے کسی قدر دبلے' گول بدن والے گویا کہ وہ قبیلہ شنوئۃ کے ایک مرد ہیں۔ پھر میری نظر عیسیٰ ؑ پر پڑی جو کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ اُن سے بہت ملتے جلتے ہیں عروہ بن مسعود ثقفی ؓ۔ پھر میں نے اچانک ابراہیم ؑ کو نماز پڑھتے دیکھا جن سے تمہارے یہ دوست (یعنی خود نبی اکرم ﷺ) بہت مشابہ ہیں۔ پھر نماز کا وقت آ گیا اور میں نے اُن سب کی امامت کی''۔

اِس سارے عمل کی حکمت یہ حقیقت واضح کرنا تھی کہ مسجدِ حرام کے ساتھ ساتھ اب مسجدِ اقصیٰ کے متولی بھی نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اُمتی ہیں۔

ہجرت کے بعد ابتداء میں مسلمانوں کی آزمائش کے لیے مسجدِ اقصیٰ کو قبلہ کا درجہ دیا گیا تھا۔ اِس کا حکم قرآنِ حکیم میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحیِ خفی کے ذریعے یہ حکم نبی اکرم ﷺ کو دیا۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام ؓ کو مسجدِ حرام سے شدید قلبی محبت تھی۔ مکی دور میں تو مسلمان نماز میں اِس طرح رُخ کرتے کہ مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ دونوں سامنے ہوتے۔ اِسے استقبالِ قبلتین کہا جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں ایک آزمائش آ گئی۔ مدینہ کے شمال میں مسجدِ اقصیٰ اور جنوب میں مسجدِ حرام ہے۔ اب اگر مسجدِ اقصیٰ کی طرف رُخ کیا جائے تو مسجدِ حرام کی طرف پشت ہو جاتی ہے۔ اِس سے مقصود صحابۂ کرام ؓ کا امتحان لینا تھا کہ آیا وہ مسجدِ حرام سے اپنی محبت کو ترجیح دیتے ہیں یا اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے مسجدِ حرام کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنا لیتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۱۴۳) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ﴾

''اور ہم نے نہیں مقرر کیا وہ قبلہ جس پر کہ (اے نبیؐ) آپ تھے مگر اِس لیے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون ہے جو رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اُس کے برعکس جو اپنی ایڑیوں کے بل رُخ پھیر لیتا ہے' اور یقیناً وہ بہت بھاری (حکم) تھا سوائے اُن لوگوں کے جنہیں اللہ نے ہدایت دی''۔

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتحان اچھی طرح سے ہوگیا تو ہجرت کے سولہ ماہ بعد ۶۲۴ء میں تحویلِ قبلہ کا حکم سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۴ میں اِن الفاظ کے ساتھ وارد ہوا :

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ط﴾

''(اے نبیؐ) ہم دیکھ رہے ہیں آپؐ کے چہرے کا بار بار اُٹھنا آسمان کی طرف۔ پس ہم پھیرے دیتے ہیں آپؐ کے چہرے کو اُس قبلہ کی طرف کہ جس سے آپؐ محبت کرتے ہیں، تو پھیر لیجیے اپنے چہرے (رخ) کو مسجدِ حرام کی طرف۔ اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں پر بھی ہو پس پھیر لو اپنے چہروں کو اُس (مسجدِ حرام) کی طرف''۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے پانچ سال بعد ۶۳۷ء میں مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کرلیا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا۔ عیسائیوں نے پُرامن طور پر ایک معاہدے کے ذریعے بیت المقدس مسلمانوں کے حوالے کیا۔ اِس سے قبل مسلمانوں نے کئی روز سے اِس شہر کا محاصرہ کررکھا تھا لیکن وہ شہر کو فتح کرنے سے قاصر تھے۔ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے مسلمانوں کو پیغام بھیجا کہ ہماری کتابوں میں اُس بادشاہ کے تمام اوصاف درج ہیں جس کے ہاتھوں یہ شہر فتح ہوگا۔ ہم تم میں ایسا بادشاہ نہیں پاتے۔ مسلمانوں نے یہ اوصاف دریافت کیے۔ اوصاف جاننے کے بعد کہا کہ یہ تو ہمارے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اوصاف ہیں۔ قرآنِ مجید میں اِس بات کا ذکر یوں ہے:

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ج﴾ (الفتح: ۲۹)

''اُن (صحابہؓ) کی مثال تورات میں ہے اور اُن کی مثال انجیل میں ہے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خصوصی طور پر بیت المقدس آنے کی دعوت دی گئی۔ آپؓ آئے اور عیسائیوں نے ایک معاہدے کے تحت یہ شہر مسلمانوں کے حوالے کردیا۔ معاہدہ کرتے وقت عیسائیوں نے مطالبہ کیا کہ یہودیوں کو اِس شہر میں داخلے کی اجازت نہ دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ ہمارا دین اِس کی اجازت نہیں دیتا۔ البتہ معاہدے میں یہ طے ہوا کہ یہودی اِس علاقہ میں آباد نہ ہوسکیں گے، یعنی یہاں کوئی رہائشی، صنعتی یا زرعی اراضی یا عمارت نہیں خرید سکیں گے۔ مسلمانوں کے تمام ادوارِ حکومت میں یہودیوں نے اِس

پابندی کوختم کرانے کی کوشش کی اور بعض مواقع پر بھاری مالی امداد کی بھی پیشکش کی، لیکن کوئی مسلمان حکمران اِس پر تیار نہ ہوا۔

دورِ بنواُمیہ میں اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ۶۸۵ء میں اُس چٹان پر ایک گنبد کی تعمیر کا آغاز کیا جہاں سے نبی اکرم ﷺ شبِ معراج آسمانوں کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اِس گنبد کی تعمیر ۶۹۱ء میں مکمل ہوئی اور یہ ''قبۃ الصخرۃ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ بعدازاں اِس گنبد کے جنوب مشرق میں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد اقصیٰ کے نام سے ایک عبادت گاہ تعمیر کی۔ یہ تعمیر ۷۰۹ء تا ۷۱۴ء جاری رہی۔ بعد کے ادوار میں بھی مسلمان سلاطین قبۃ الصخرۃ اور مسجد اقصیٰ میں مختلف تعمیراتی کام کراتے رہے۔ یہودی قبۃ الصخرۃ کی تصاویر کے نیچے مسجد اقصیٰ لکھ کر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ جب وہ مسجد اقصیٰ کو شہید کریں تو لوگوں کو میڈیا پر قبۃ الصخرۃ کی تصاویر دکھا کر مطمئن کیا جائے کہ مسجد جوں کی توں سلامت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے ایک ہزار سال مکمل ہونے پر یورپ کے عیسائیوں میں مذہبی رہنماؤں نے بہت جوش وخروش پیدا کیا اور اُنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش یعنی بیت المقدس کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کے لیے جنگ پر آمادہ کیا۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی جس کے لیے زور وشور سے تیاری شروع ہوگئی اور اِس کے نتیجہ میں ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس چھین لیا۔ اِس شہر مقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ۸۸ برس تک رہا۔ ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں نے صلاح الدین ایوبیؒ کی قیادت میں بیت المقدس دوبارہ حاصل کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے سازش کے ذریعے عربوں اور ترکوں کو آپس میں لڑا کر بیت المقدس سے ترکوں کو بے دخل کردیا۔ پھر مشرق وسطیٰ کو کئی عرب ممالک میں تقسیم کرکے اپنی اجارہ داری قائم کردی۔ ۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے ''اعلانِ بالفور'' کے ذریعے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ یہودیوں نے فلسطینیوں سے منہ مانگے داموں جائیدادیں خریدیں اور جنہوں نے اپنی جائیدادیں فروخت کرنے سے انکار کیا اُنہیں برطانوی حکومت کے تعاون سے زبردستی بے دخل کردیا گیا۔ دستاویزات کے ذریعے ثابت کیا گیا کہ فلاں جائیداد دو ہزار سال قبل ہمارے فلاں بزرگ کے نام تھی جس پر آج کوئی فلسطینی قابض ہے۔ برطانوی حکومت نے اِس طرح کے دعوے

قبول کیے اور یوں یہودی فلسطین میں آباد ہوتے چلے گئے۔ یہ دھاندلی مسلسل جاری رہی۔ یہودیوں کو باہر سے لاکر فلسطین میں آباد کیا جاتا رہا جبکہ اُنہیں اٹھارہ سو برس قبل یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ بالآخر برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے ۵۶ فیصد علاقے پر قبضہ کرکے ایک یہودی ریاست اسرائیل کے نام سے قائم کردی گئی۔ یہودیوں کو جب برطانیہ کے زیرِ سرپرستی فلسطین میں ناجائز طور پر آباد کیا جارہا تھا تو اس پر اقبال نے کہا تھا:

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا؟

اسرائیل کے اِس طرح قیام کو کوئی بھی باضمیر انسان نہ جائز قرار دے گا اور نہ ہی تسلیم کرے گا۔ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح نے اسرائیل کو مغربی دنیا کا ناجائز بچہ قرار دیا۔ ۲۵؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جب کہ ابھی قیامِ اسرائیل کے منصوبہ کو پیش کیا جارہا تھا' بانیٔ پاکستان نے رائٹر نیوز ایجنسی کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

''فلسطین کے بارے میں ہمارے موقف کی وضاحت اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے سربراہ چودھری ظفراللہ خان نے کردی ہے۔ مجھے اب بھی یہ امید ہے کہ تقسیم (فلسطین) کا منصوبہ مسترد کردیا جائے گا' ورنہ ایک خوفناک چپقلش کا شروع ہونا ناگزیر اور لازمی امر ہے۔ یہ چپقلش صرف عربوں اور منصوبۂ تقسیم نافذ کرنے والوں کے درمیان نہ ہوگی بلکہ پوری اسلامی دنیا اِس فیصلہ کے خلاف عملی بغاوت کرے گی' کیونکہ ایسے فیصلے (اسرائیل کے قیام) کی حمایت نہ تاریخی اعتبار سے کی جاسکتی ہے اور نہ ہی سیاسی اور اخلاقی طور پر۔ ایسے حالات میں پاکستان کے پاس اِس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا کہ عربوں کی مکمل اور غیر مشروط حمایت کرے اور خواہ مخواہ کے اشتعال اور دست درازیوں کو روکنے کے لیے جو کچھ اُس کے بس میں ہے پورے جوش وخروش اور طاقت سے بروئے کار لائے''۔

یہاں تک کہ یہود کے خالصتاً مذہبی عناصر بھی اسرائیل کے اِس طرح سے قیام کو جائز نہیں سمجھتے۔ معروف یہودی اسکالر ڈاکٹر **ایلمر بلجر** نے اپنے مقالے ''کیا اسرائیل بائیبل کی پیشینگوئیوں کی تکمیل ہے'' میں لکھا ہے کہ:

''یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کوئی پکا مذہبی یہودی یہ نہیں مانتا کہ موجودہ اسرائیلی ریاست اُس طریقۂ عمل سے وجود میں آئی ہے جو بائیبل کے احکامات سے ذرہ بھر

بھی مطابقت رکھتا ہو'' ۔

جون ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل نے بیت المقدس سمیت فلسطین کے مزید ۲۲ فیصد علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ بیت المقدس پر اُن کے قبضہ کو ۴۰ برس ہونے کو آرہے ہیں۔ یہودیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہورہا ہے اور اب وہ چاہتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے تیسری بار اپنا ہیکل تعمیر کرسکیں۔ اِسی لیے اب مسجد اقصیٰ کے گرد زور وشور سے کھدائی کا عمل شروع کر دیا گیا ہے۔عیسائی اِس معاملہ میں یہودیوں کی پوری طرح سے پشت پناہی اِس لیے کررہے ہیں کہ اُنہیں یہودیوں نے مسلسل پروپیگنڈے کے ذریعے یہ بات سمجھا دی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے لیے ضروری ہے کہ اِس سے قبل بیت المقدس میں ایک اسرائیلی ریاست قائم ہوجائے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اِس حوالے سے مل کر یہ منصوبہ بندی کی تھی کہ ۲۰۰۷ء میں مسجد اقصیٰ کو شہید کرنے سے قبل اُن تمام مسلمان ملکوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی جائے جن سے اِس ناپاک یہودی منصوبہ کو کوئی خطرہ ہے۔ لہٰذا ۲۰۰۱ء میں پاکستان اور افغانستان کو تباہ کرنے کا منصوبہ تھا۔ پاکستان تو ایک یوٹرن لے کر فوری تباہی سے بچ گیا لیکن افغانستان میں اسلامی حکومت کو تہس نہس کر دیا گیا۔۲۰۰۳ء میں عراق پر حملہ کر کے اُس کا بھرکس نکال دیا گیا۔ ۲۰۰۵ء میں ایران کے خلاف اقدام کا منصوبہ تھا لیکن عراق و افغانستان میں غیر معمولی مزاحمت نے اِس منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔ بہر حال اب بھی یہودی لابی امریکہ کی قیادت پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ ایران کے خلاف بھی اقدام کر دیا جائے۔

اِس پورے معاملہ میں پاکستان اور افغانستان کی' جو عرب کے مشرق میں واقع ہیں' خصوصی اہمیت ہے۔حدیثِ مبارکہ ہے:

((يَخْرُجُ نَاسٌ مِنَ الْمَشْرِقِ فَيُوَطِّئُوْنَ لِلْمَهْدِيِّ يَعْنِىْ سُلْطَانَهُ)) (٦)

''مشرق سے فوجیں نکلیں گی جو مہدی کی حکومت قائم کرنے کے لیے منزل پر منزل مارتی چلی آئیں گی''۔

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشرق کے کسی علاقے میں پہلے ہی اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہو گی۔ایک اور حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ علاقہ خراسان کا ہوگا:

((تَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَايَاتٌ سُوْدٌ لَا يَرُدُّهَا شَيْءٌ حَتّٰى تُنْصَبَ بِإِيْلِيَاءَ)) (٧)

''خراسان کی جانب سے علم چلیں گے' ان کو کوئی روک نہ سکے گا جب تک کہ وہ ایلیاء
میں جا کر نصب نہ ہو جائیں''۔

''ایلیاء'' بیت المقدس کا ایک دوسرا نام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں خراسان اُس علاقے کا نام تھا جس میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور افغانستان کا بڑا حصہ شامل ہے۔ گویا یہی علاقہ ہے جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ اِس خطہ میں طالبان کی اسلامی حکومت کا قائم ہونا' دیگر جہادی سرگرمیاں اور پھر پاکستان کا ایٹمی قوت بن جانا اسرائیل کے لیے باعث تشویش ہے۔ 1967ء میں بن گوریان نے پیرس میں کہا تھا کہ ہمیں عرب ممالک سے نہیں صرف پاکستان سے خطرہ ہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو امریکہ میں پیشکش کی گئی تھی کہ اگر پاکستان اسرائیل کو تسلیم کر لے تو پاکستان کو ناقابلِ تصور مالی امداد دی جائے گی۔ اُنہوں نے اِس کے جواب میں کہا تھا: "Our souls are not for sale"۔ پچھلے دنوں جب پرویز مشرف صاحب نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات کی تو بھارت میں متعین اسرائیلی سفیر کے اعلیٰ کونسل مشیر لیوسی رائٹس نے کہا کہ ''اگر صدر پرویز مشرف اسرائیل کو تسلیم کروالیں تو اسرائیل پاکستان کے لیے وہ کچھ کرسکتا ہے جس کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں ہے''۔

آج جب کہ مسجد اقصیٰ کی شہادت کے لیے کارروائی کا آغاز کر دیا گیا ہے' ہمیں اپنی غیرتِ دینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی حکومت کو اسرائیل کے اِس ناپاک عزم کے خلاف فیصلہ کن موقف اختیار کرنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ بعض دانشور یہ گمراہی پھیلا رہے ہیں کہ مسجد اقصیٰ کی مسلمانوں کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں' لیکن مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ اِس گمراہ کن تصور کی نفی کے لیے کافی ہیں:

((وَلَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ : مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ هٰذَا)) (۸)

''تین مساجد کے علاوہ کسی جگہ کا (ثواب کی نیت سے) قصد کر کے سفر کرنا جائز نہیں ہے' مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ اور میری اِس مسجد (یعنی مسجد نبویؐ) کا''۔

((مَنْ اَهَلَّ بِحَجَّةٍ اَوْ عُمْرَةٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی اِلَی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَأَخَّرَ اَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ)) شَکَّ عَبْدُاللّٰهِ

اَیَّتُھُمَا قَالَ (۹)

''جس نے بھی مسجد اقصیٰ سے مسجد حرام کے لیے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھا اُس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے' یا اُس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی''۔ عبداللہ (راوی) کو شک گزرا کہ آپ ﷺ نے اِن دونوں میں سے کون سے الفاظ بیان فرمائے ہیں۔

((مَنْ صَلّٰی فِی الْمَسَاجِدِ الْأَرْبَعَۃِ غُفِرَ لَہٗ ذَنْبُہٗ)) (۱۰)

''جس نے چار مساجد میں نماز پڑھی اُس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے''۔

امام السندی نے اِس حدیث کی وضاحت میں تحریر کیا ہے کہ:

فی المساجد الأربعة لعل المراد بها مسجد مكة والمدينة ومسجد قباء والمسجد الأقصٰى

''چار مساجد سے مراد ہے مکہ اور مدینہ کی مساجد' مسجدِ قبا اور مسجدِ اقصیٰ''۔

((صَلاَ ۃُ الرَّجُلِ فِیْ بَیْتِہٖ بِصَلاَۃٍ وَّصَلاَ تُہٗ فِی مَسْجِدِ الْقَبَائِلِ بِخَمْسٍ وَّعِشْرِیْنَ صَلاَۃً وَّصَلاَ تُہٗ فِی الْمَسْجِدِ الَّذِیْ یُجَمَّعُ فِیْہِ بِخَمْسِ مِائَۃِ صَلاَۃٍ وَّصَلاَ تُہٗ فِی الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰی بِخَمْسِیْنَ اَلْفِ صَلاَۃٍ وَّصَلاَ تُہٗ فِی مَسْجِدِیْ بِخَمْسِیْنَ اَلْفِ صَلاَۃٍ وَّصَلاَ تُہٗ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ بِمِائَۃِ اَلْفِ صَلاَۃٍ)) (۱۱)

''ایک شخص کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا ایک نماز کے اجر کے برابر ہے اور اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا پچیس نمازوں کے اجر کے برابر ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنا پانچ سو نمازوں کے اجر کے برابر ہے اور مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھنا پچاس ہزار نمازوں کے اجر کے برابر ہے اور مسجدِ نبویؐ میں نماز پڑھنا پچاس ہزار نمازوں کے اجر کے برابر ہے اور مسجدِ حرام میں نماز پڑھنا ایک لاکھ نمازوں کے اجر کے برابر ہے''۔

آج کیفیت یہ ہے کہ:

مسجد اقصیٰ روتی ہے اُمتِ مسلمہ سوتی ہے!

کاش ہمارا کوئی حکمران پھر سے صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کی صورت اختیار کر کے میدان میں آئے اور مسجد اقصیٰ کی حفاظت کی خدمت بجا لا کر عظیم سعادتوں سے سرفراز ہو جائے۔ آمین!

حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء ، باب قول اللہ تعالیٰ ووھبنا لداوٗد سلیمان......

(۲) تفسیر ابن کثیر ٢/٦٤۔ عن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

(۳) رواہ الطبرانی۔

(٤) سنن النسائی، کتاب المساجد، باب فضل المسجد الاقصی والصلاۃ فیہ۔

(٥) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذکر المسیح ابن مریم والمسیح الدجال۔

(٦) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب خروج المھدی۔

(٧) سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء فی النھی عن سب الریاح۔

(٨) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم النحر۔ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد۔

(٩) سنن ابی داوٗد، کتاب المناسک، باب فی المواقیت۔

(١٠) سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، باب ثواب من توضأ کما امر۔

(١١) سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب ما جاء فی الصلاۃ فی المسجد الجامع۔

خودکش دھماکوں کا اہم سبب:
محرومیاں

مرزا عمران حیدر☆

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے بہترین مخلوق ہونے کا اعزاز حضرتِ انسان کو حاصل ہے۔ انسان کی بہت ساری خوبیوں میں سے ایک اہم خوبی اس کی جرأت اور ہمت ہے۔ دوسرے بہت سارے عوامل کے ساتھ جرأت وہ خوبی ہے جس کی بدولت انسان نے تسخیر کائنات کے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں کہ خود انسانی عقل ورطۂ حیرت میں ہے۔ انسان کی اس خوبی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی کچھ مزید صفات کا قرآن میں ذکر فرمایا ہے‘ جن میں سے ایک عجلت پسندی ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ﴾ (الانبیاء:۳۷)

’’انسان بڑا جلد باز پیدا کیا گیا ہے‘‘۔

اسی جلد بازی کا مظہر یوں بیان فرمایا:

﴿اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ۟ۙ۷۲﴾ (الاحزاب)

’’ہم نے یہ امانت آسمانوں‘ زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اسے بھاری جانا اور اس (امانت) کو انسان نے اٹھا لیا۔ یقیناً یہ (انسان) بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے اس امانت کو آسمانوں‘ زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو وہ اس امانت کی ذمہ داریوں سے گھبرائے اور ان کے پورا نہ کر سکنے کے خوف سے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ان

☆ شعبہ تحقیق اسلامی‘ قرآن اکیڈمی لاہور

کے مقابلے میں انسان جلد باز نکلا' اس نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کا عزم کرلیا جن کو آسمان' زمین اور پہاڑ اپنی تمام تر وسعت' مضبوطی اور قوت کے باوجود نہ اٹھا سکے۔ انسان کا یہ انداز بڑا عمدہ تھا' لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کی دو مزید صفات بیان فرمادیں:

ظَلُوْمًا : یعنی اپنے آپ پر کنٹرول نہ رکھنے والا

جَھُوْلًا : یعنی حقیقت حال سے ناواقف۔

اب انسان کی ان تینوں صفات کو اکٹھا کیا جائے تو صورت حال یہ بنے گی کہ صورتِ واقعہ سے ناواقفیت کے باوجود انسان کسی بھی کام کے کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ کرتا ہے اور جب کام کرتا ہے تو پھر اس میں بسا اوقات اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھ پاتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جرأت اور جذبے کی قدر کی ہے اور اس کی اس صفت جرأت کے باوجود اس کو مشقت میں مبتلا نہیں کیا' بلکہ جہاں دیکھا کہ صورتِ حال انسانی اختیار سے باہر ہونے کو ہے وہاں اس کے لیے نرمی اور آسانی کا سامان کردیا۔ شرعی احکامات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر رمضان کے روزے فرض ہیں۔ اپنی تمام تر پابندیوں کے ساتھ روزے رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے' لیکن جیسے ہی یہ پابندیاں کسی انسان کے کنٹرول سے باہر ہونے لگتی ہیں وہیں اس کے لیے بہت بڑی آسانی پیدا کردی جاتی ہے' لہٰذا مسافر' بیمار' حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت کے لیے رخصت کا حکم آجاتا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلّف ٹھہراتے ہیں۔''

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جرأت اور عجلت پسندی انسان کی دو بنیادی اور فطری خصوصیات ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ان صفات کو مثبت طور پر استعمال کرے۔ ذیل میں ہم ان انسانی خصوصیات کے مثبت اور منفی استعمالات کو مثالوں سے واضح کررہے ہیں۔

انسانی صفات کا مثبت و منفی استعمال

انسان کی ان خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں انسان کو بہت سے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات کا معتدل طریقے سے سامنا کرنے کا طریقہ بھی

ہمیں اسلام سکھاتا ہے۔ اس دنیا میں عام انسانوں کی طرح‘ بلکہ ان سے بھی بڑھ کر‘ انبیاء کرام علیہم السلام کو انتہائی سخت حالات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا‘ حتیٰ کہ انہیں اپنی جان کی قربانی بھی پیش کرنی پڑی۔ کسی کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا تو کسی کو قتل ہونا پڑا۔ انبیاء کے ساتھ ساتھ دیگر اہل ایمان بھی ان آزمائشوں کا سامنا کرتے رہے۔ مثال کے طور پر سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کو قید کر کے مکہ میں لا کر فروخت کر دیا گیا تو ان کے خریدار وہ لوگ بنے جن کے عزیز و اقارب مسلمانوں کے ہاتھوں بدر و اُحد میں قتل ہوئے تھے۔ اپنے ان اعزہ کا بدلہ لینے کے لیے انہوں نے حضرت خبیبؓ کو خریدا اور اذیت ناک طریقے سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے شہید کر دیا۔ وہ ظالم ہر ظلم پر پوچھتے بتاؤ اگر تمہاری جگہ محمد (ﷺ) کو لایا جائے تو کیا خیال ہے؟ آگے سے ایک ہی جواب ملتا کہ میری جان جاتی ہے تو چلی جائے‘ میں اس کے عوض میں محمد ﷺ کو کانٹا چبھنا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سختی کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی جن راحتوں کے حق دار ہوئے اس فانی دنیا میں رہتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہم کا اللہ کے راستے میں پہنچائی گئی تکالیف پر صبر کرنا انسان کی اسی صفت جرأت کا مثبت استعمال ہے۔

اہل ایمان کا ہمیشہ سے امتحان ہوتا رہا ہے‘ بلکہ امتحان ہوتا ہی ان لوگوں کا ہے جن کے سینے میں ایمان کی رمق موجود ہوتی ہے۔ انہوں نے تکالیف و مصائب میں اللہ سے نصرت بھی طلب کی لیکن کبھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس اصول سے کہ جب سختی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھر آسانی ہی پیدا ہوتی ہے‘ بہرہ مند ہوئے۔ جہاں کہیں جلد بازی کا مظاہرہ ہوا وہیں اس کا نقصان بھی ظاہر ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کے ساتھ آ کر مسلمان ہونے والے ایک صحابی کے بارے میں روایات میں ملتا ہے کہ جب ان کو کسی مرض کی وجہ سے ناقابل برداشت تکلیف ہوئی تو انہوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا جس کے نتیجے میں وہ فوت ہو گئے۔ بعد میں حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کی خواب میں ان سے ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے اپنا ہاتھ چھپا رکھا تھا۔ پوچھا بتاؤ کس حال میں ہو؟ جواب دیا اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ کے سوا مجھے معاف کر دیا ہے۔ جب یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا تو آپؐ نے دعا کی: ((**اَللّٰھُمَّ وَلِیَدَیْهِ فَاغْفِرْ**))(۱) ”اے اللہ اس کے ہاتھ کو بھی معاف کر دے“۔

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب الدلیل علی ان قاتل نفسه لا یکفر۔

خودکش حملوں اور دھماکوں کے بنیادی اسباب

یہ دنیا مشکلات اور امتحانات سے عبارت ہے۔ انسان حقیقت حال سے ناواقف ہوتا ہے اور اپنی صلاحیتوں اور توقعات کا غلط اندازہ لگا کر جلد بازی میں ایسا فیصلہ کر لیتا ہے جو اُس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال خودکش دھماکہ ہے۔ خودکش دھماکے کی شرعی حیثیت کیا ہے' یہ اس وقت موضوعِ تحریر نہیں ہے' لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ایک انسان اتنا بڑا فیصلہ کس بنیاد پر کرتا ہے؟

ایک آدمی حقیقت حال سے ناواقفیت کی بنا پر یا پھر حقیقت سے آنکھیں موند کر کچھ توقعات وابستہ کر لیتا ہے۔ پھر ان توقعات کے پورا ہونے کے لیے جلد بازی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جب وہ توقعات پوری نہیں ہوتیں تو جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی قدم اٹھا لیتا ہے جو اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

آج دنیا کی دوڑ دنیا داری تک محدود ہے۔ ہر انسان اسی فکر میں ہے کہ میری آمدنی کس طرح زیادہ ہو سکتی ہے' میری اولاد کو اچھی نوکری کن راستوں سے مل سکتی ہے اور وہ راستے پھر زندگی کا مقصد بن جاتے ہیں۔ معیارِ زندگی بلند کرنے کا جنون ہر ایک کے سر میں سمایا ہوا ہے اور یہ ایسا جنون ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔ نتیجے کے طور پر ساری زندگی اسی جنون کی نذر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں انسان اپنے مقصد کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ یہ دنیا جس کی مثال ایک راستے اور مسافر خانے سے دی گئی ہے' جو نشانِ منزل تھی آج منزل بن چکی ہے' ان حالات میں دین اور دین داری اپنے مفہوم کھو رہی ہے۔ دین داری ثانوی سے بھی اگلی حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ اخلاقی اقدار مٹ رہی ہیں۔ تہذیب وثقافت حالات کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ سوچ کے پیش نظر دنیا طبقاتی تقسیم کا شکار ہے۔ خرابیوں کا ایک طوفان ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ انہی کیفیتوں کا نام ظلم ہے۔ کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دینے کو ظلم کہتے ہیں۔ اسی ظلم کے بارے میں حدیث قدسی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((يَا عِبَادِىْ اِنِّىْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِىْ وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا)) (۱)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم الظلم۔

''اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کر دیا ہے' پس تم آپس میں ظلم نہ کیا کرو''۔

اس وقت دنیا میں ہر طرف ظلم ہی ظلم نظر آ رہا ہے۔ کسی چیز کو اس کے مقام سے ہٹانے سے محرومیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ حقیقت حال سے ناواقف ان محرومیوں کا شکار لوگ جلد بازی میں جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے فیصلے کر جاتے ہیں جو ایک دنیا کو بھگتنے پڑتے ہیں۔

محرومیوں کے شکار انسان کو جب کہیں سے اپنے دکھوں کا مداوا ہوتا نظر نہیں آتا تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ ہر ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو اُس کے لیے ممکن ہو سکے۔ پھر وہ لوگوں کی خوشیاں بھی نہیں دیکھ سکتا' بلکہ اَوروں کی خوشیاں اس کے غموں میں اضافے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ یہ کیفیت اس کی مایوسی کو انتقام میں بدل دیتی ہے۔ وہ ہر ایسے انسان سے انتقام لینا چاہتا ہے جو اُس کے غموں کا سبب یا خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بنا ہے۔ ایسے میں حلال وحرام اور فائدہ ونقصان کی تمیز اُس کی آنکھوں سے اٹھ جاتی ہے اور پھر خبر آتی ہے ''خودکش دھماکہ ہو گیا''۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہر انسان کو کائنات میں سب سے محبوب اپنی جان ہوتی ہے' حتیٰ کہ وہ والدین جو اپنی اولاد پر سب کچھ قربان کر سکتے ہیں' اپنی جان کی قربانی دینے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوتے۔ پھر ایک انسان اپنی زندگی کی قیمتی ترین متاع کو لٹانے کے لیے کیوں تیار ہو جاتا ہے؟ اس قدر دردناک اور اذیت ناک موت کو گلے لگانے کے لیے کون سی چیز اس کو آمادہ کرتی ہے؟

یہ اس کی محرومیوں کا اظہار ہے۔ وہ اسے اپنے غموں کا مداوا سمجھتا ہے۔ وہ دوسروں کا زیادہ سے زیادہ نقصان کر کے اپنے مُردہ جسم کے دل کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ اس کی مایوسی کی انتہا ہے۔ اپنی روح کو تسکین پہنچانے کے لیے کوئی اور حل اس کے پاس ہوتا تو وہ ضرور اسے استعمال کرتا' لیکن اس کے نزدیک یہی آخری حل تھا جو وہ کر چکا۔

جانے والا جا چکا ہے' لیکن اپنے پیچھے کس قدر فتنہ وفساد' آہیں اور سسکیاں اس نے چھوڑی ہیں' اس کا اسے اندازہ نہیں ہے۔ اب اس کے لگائے ہوئے زخموں پر مرہم رکھنے کا انداز بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ایوانِ اقتدار سے آواز آتی ہے ہم دہشت گردوں کو سختی سے کچل دیں گے۔ بابا یہ تو پہلے ہی کچلے ہوئے لوگ تھے۔ کچلے ہوؤں کو اور کتنا کچل لو گے؟ ذرا اندازہ تو کیجیے جس بوڑھے آدمی کی بیساکھیوں کو توڑ دیا جائے' جس کے سامنے بھائیوں کو خون میں نہلا دیا

جائے‘ جس کے خاندان کو گھر سمیت تباہ کر دیا جائے‘ جس کے لخت جگر کی لاش کے ٹکڑے بھی پورے نہ ہو سکیں‘ جو عزت کی پامالی کے بعد فریاد بھی نہ کر سکے‘ جس سے جینے کا حق چھین لیا جائے اور ایسے میں ان افراد کو انصاف اور امن کی کوئی جگہ نظر نہ آ رہی ہو‘ بلکہ آگے سے ڈنڈے اور کچلنے کی آوازیں آئیں تو آپ ان سے کس قسم کے رویے کی اُمید رکھتے ہیں؟ جس بچے کے باپ کو گھر سے اٹھا لیا گیا ہو‘ شنوائی کے بھی آثار نہیں تو شفقت پدری سے محروم اس بچے سے آپ کس اخلاقی قدر کی توقع کر سکتے ہیں؟

میں اس وقت خود کش حملے کی شرعی حیثیت پر بات نہیں کر رہا‘ لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ اور مجاہدین اسلام کی ایمان و یقین والی شہادت کا انداز ہے جس میں مرتے وقت ’ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ کا نعرہ بلند ہو رہا ہے‘[۱] تو دوسری طرف ایک مسلمان کی مایوسی سے لبریز خودکشی اور خودکش دھماکے کے ساتھ موت کا منظر ہے۔ ان دونوں میں اس قدر تفاوت کیوں ہے؟ بنظر عمیق دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہے۔ مسلمان کے لیے اسلام سے بڑھ کر کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ مسلمان کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی یہی ہے کہ وہ پکا مسلمان بن جائے۔ ہمیں اسلام سے گہری وابستگی کو انتہا پسندی کہنے اور فحاشی و عریانی میں لپٹے کفر و الحاد کو روشن خیالی کہنے کی روش کو ترک کرنا ہو گا۔ اسلام انسانوں میں نہ محرومیاں پیدا کرتا ہے اور نہ پیدا کرنے کی اجازت دیتا ہے‘ بلکہ یہ تو محرومیوں کے شکار لوگوں کی محرومیوں کا ازالہ کرتا ہے۔ ذرا ایک نظر اسلامی تعلیمات پر ڈال کر دیکھیں تو سہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ اَسْفَلَ مِنكُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لاَّ تَذْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ)) [۲]

’’(دنیاوی معیار اور مرتبے میں) اپنے سے نیچے والے کی طرف دیکھو اور اپنے سے اوپر والے کی طرف نہ دیکھو۔ اس طرح تم (اپنے اوپر ہونے والی) اللہ کی نعمتوں کو معمولی نہیں سمجھو گے‘‘۔

یہ انسان جس کی اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بیان کی تھی کہ حقیقت حال سے ناواقف اور اپنے

---

(۱) مسند احمد۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الزہد والرقائق۔

اوپر کنٹرول رکھنے والا نہیں ہے' اس حدیث طیبہ کے ذریعہ اسے اللہ تعالیٰ کی تقسیم دولت کے بارے میں حکمت کی خبر دیتے ہوئے اپنے اوپر کنٹرول کا درس دیا جا رہا ہے۔ صحیح اسلامی سوچ اور فکر پیدا ہو جائے تو احساسِ محرومی پیدا ہی نہیں ہوتا' اور اگر ہو بھی جائے تو اس کا بھی علاج موجود ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے کہ جب تم شوربہ پکاؤ تو اس میں پانی بڑھا لو اور اس میں سے کچھ حصہ اپنے ہمسائے کی طرف بھیجو۔ ہمسائے کے گھر لینے دینے سے اور پھر تحائف دینے کے عمومی حکم کے بعد محبتوں کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ پھر فرمایا کہ چھلکے والا پھل کھانے کے بعد اس کے چھلکے اس طرح باہر نہ پھینکو کہ ہمسائے کی اس پر نظر پڑے۔ گویا اس نعمت سے محرومی کا اسے احساس ہی نہ ہونے دو۔ اس پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ فرمایا تم میں سے کوئی اس وقت تک مکمل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے (مسلمان) بھائی — یا ایک حدیث کے مطابق اپنے پڑوسی — کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔(۱)

علماء میں یہ بات معروف ہے کہ ہمسائیگی کا دائرہ چالیس گھروں تک پھیلتا ہے۔ ایک گھر سے اگر اس دائرہ کو پھیلایا جائے تو زنجیر کی طرح بستی کا آخری گھر بھی اسی سلسلے سے منسلک ہو جائے گا اور پھر ((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ))(۲) کا حکم پوری اُمت مسلمہ کو ایک لڑی میں پرو دے گا۔ رزق کی کمی بیشی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکمت بھرا اصول اسلامی معاشرے میں رخنہ نہیں ڈالتا بلکہ اسے ایک دوسرے سے زیادہ مربوط کرتا ہے۔ دورِ غلامی کے غلاموں کے بارے میں اور آج کے ملازمین کے بارے میں ہماری شریعت میں یہ واضح رہنمائی موجود ہے کہ جو خود کھاؤ انہیں بھی کھلاؤ' جو خود پہنو انہیں بھی پہناؤ۔ معاشی میدان کو زکوٰۃ تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکَاۃِ))(۳)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔
وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی انّ من خصال الایمان ان یحب ......

(۲) صحیح البخاری' کتاب المظالم والغصب' باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه۔
وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم ظلم المسلم ......

(۳) جامع الترمذی' کتاب الزکاة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء ان فی المال حقا سوی الزکاۃِ۔

''یقیناً زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے''۔

اگر الٰہی فیصلے کے مطابق کسی کو یتیمی کا سامنا کرنا پڑ جائے تو اسے زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لیے کھلا نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کی پرورش کرنے والے گھر کو معاشرے کا بہترین خاندان ہونے کا ایوارڈ دیا گیا ہے۔

انسان حقیقت حال سے ناواقف ہوتا ہے' اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھتا' لیکن اس کے باوجود حق کو قبول کرنے اور اس پر ڈٹے رہنے کے لیے انسان جب اپنی صفت جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اسلام اسے پسند کرتا ہے۔ یہ جرأت اسلام سکھلاتا ہے تاکہ محرومیاں ختم ہوں اور دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ اسلام سے گہری وابستگی کو انتہا پسندی یا دہشت گردی نہیں بلکہ امن و فلاح پسندی سمجھئے' جس میں دین و دنیا کی کامیابی ہے ۔

ہم نے جلا کے دل سر راہ رکھ دیا
اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی!

بحث و نظر

جامعہ حفصہ اور معروف ومنکر

حافظ محمد زبیر ☆

اسلام آباد میں جامعہ حفصہ اور لال مسجد کی انتظامیہ اور حکومت کے درمیان تنازع بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔اس اختلاف کی رپورٹیں ۲۰ جنوری کو حکومت پاکستان کی طرف سے مسجد امیر حمزہ اور اس سے ملحق مدرسے کو گرانے کے بعد میڈیا میں آنا شروع ہوئیں۔لال مسجد کے خطیب کے ایک مبینہ بیان کے مطابق سی ڈی اے اسلام آباد کی طرف سے کچھ عرصے کے وقفے کے ساتھ سات سے زائد مساجد کو گرایا گیا۔علاوہ ازیں معروف کالم نگار جناب عرفان صدیقی کے ۲۸ جنوری ۲۰۰۷ء کے کالم کے مطابق اسلام آباد انتظامیہ نے جامع مسجد ضیاء الحق' جامع مسجد شکرلال' جامع مسجد منگرال ٹاؤن' جامع مسجد راول چوک' مسجد شہداء' جامع مسجد مدنی' جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو بھی گرانے کے لیے نوٹس جاری کر دیے تھے۔اسلام آباد انتظامیہ کی طرف سے مساجد و مدارس کو شہید کرنے کی اس مہم کی وجہ سے ملک بھر کے علماء اور مذہبی حلقوں میں اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔علماء کے ایک اجلاس میں ''تحریک تحفظ مساجد'' کے قیام کا اعلان ہوا جس میں جامعہ حفصہ کی طالبات نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے عزم کا اظہار کیا اور حکومت کو اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے جامعہ حفصہ سے ملحق دو بڑے کمروں پر مشتمل ایک چلڈرن لائبریری پر قبضہ کر لیا۔

۲۷ جنوری کو لال مسجد کے مہتمم مولانا عبدالعزیز کی طرف سے اخبارات میں ایک بیان شائع ہوا جس میں حکومت سے چند مطالبات کیے گئے تھے۔ان مطالبات میں گرائی جانے والی مساجد کی تعمیر نو' ملک میں فحاشی کلچر کا خاتمہ' جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو بھیجے گئے حکومتی نوٹس کی واپسی اور پرویز مشرف کا مساجد گرانے کے حوالے سے اللہ اور قوم سے معافی مانگنا شامل تھا۔مولانا نے مزید یہ بھی کہا کہ طالبات کا چلڈرن لائبریری پر اُس وقت تک قبضہ برقرار رہے گا جب تک ملک کے اندر اسلامی نظام نافذ نہیں کیا جاتا۔مولانا کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لال مسجد کی انتظامیہ نے شروع دن سے مساجد کی تعمیر نو کے علاوہ اپنے مطالبات میں فحاشی کے خاتمے اور اسلامی نظام کے نفاذ کی بات کی جو کہ ایک مستحسن امر ہے۔

۳ فروری کے اخباری بیانات کے مطابق اسلام آباد پولیس نے کریک ڈاؤن کر کے مدارس کے

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

۱۱۲۵ اساتذہ اور طلبہ کو گرفتار کرلیا۔ نیز جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو اپنے تجاوزات ختم کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹے کا نوٹس دے دیا۔

۱۱ فروری کے اخباری بیانات کے مطابق لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز نے ایک نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بیان دیا کہ ہمیں بم سے اڑانے اور معاملہ فوجی بریگیڈ کے پاس بھجوانے کی دھمکی دی جارہی ہے، حکومت نے ہمارے فون کاٹ دیے، میرا موبائل فون چار گھنٹے بند رہا۔ اسی طرح حکومت دوسو طالبات کو لائبریری سے بے دخل کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا چاہتی ہے، حالانکہ طالبات نے لائبریری پر قبضہ صرف اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے کیا تھا۔

۱۲ فروری کی اخباری اطلاعات کے مطابق لائبریری سے طالبات کا قبضہ ختم کروانے کے لیے علماء اور حکومت کے مابین مذاکرات کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو گئے‘ جس پر انتظامیہ نے ویمن پولیس‘ ایف سی اور رینجرز طلب کرلی۔ جامعہ حفصہ نے بھی فارغ التحصیل طالبات کو بلوا لیا۔

۱۳ فروری کی اخباری اطلاعات کے مطابق وزیر داخلہ جناب آفتاب احمد شیر پاؤ کی رہائش گاہ پر حکومت اور علماء کے درمیان تقریباً چار گھنٹے مذاکرات ہوتے رہے‘ جس کے نتیجے میں علماء‘ سی ڈی اے اور انتظامیہ کے نمائندوں پر مشتمل آٹھ رکنی کمیٹی قائم کی گئی۔ علاوہ ازیں مسجد امیر حمزہ کی دوبارہ تعمیر کا نوٹیفیکیشن بھی جاری کیا گیا۔

۱۶ فروری کی اخباری اطلاعات کے مطابق وزیر اعظم جناب شوکت عزیز نے ایک نجی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ہم جب چاہیں لائبریری کا قبضہ ختم کرا سکتے ہیں‘ قبضہ چھڑانا کوئی مسئلہ نہیں ہے‘ لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ معاملہ افہام و تفہیم اور خوش اسلوبی سے حل ہو‘ تاکہ بچیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

۹ مارچ کی اخباری اطلاعات کے مطابق جناب پرویز مشرف نے اسلام آباد میں یومِ خواتین کے موقع پر کنونشن سنٹر میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ لال مسجد میں خواتین نے حکومت کو چیلنج کیا ہے‘ ہمیں کمزور نہ سمجھا جائے‘ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ خواتین خودکش حملے کے لیے تیار ہیں‘ لیکن میں ڈرنے والا نہیں ہوں‘ میں اندر جا کر لیڈ کرنے کو تیار ہوں‘ لیکن کیا ادھر جا کر عورتوں کو ماریں؟ مسجد کو اڑا دیں؟

تنازع کا دوسرا مرحلہ اور آنٹی شمیم کے واقعے کی اصل حقیقت

درمیان میں کچھ دن فریقین کی طرف سے خاموشی رہی‘ لیکن ۲۵ مارچ کو جامعہ حفصہ کی طالبات اور لال مسجد کے طلبہ کی طرف سے آنٹی شمیم نامی ایک خاتون اور اس کی بہو اور بیٹی کے جامعہ حفصہ منتقلی کا ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس تنازع کو ایک دفعہ پھر بھڑکا دیا۔ آنٹی شمیم کے واقعے کا حقیقی پس منظر کیا ہے اس بارے میں ہم لال مسجد کی انتظامیہ کا وہ بیان یہاں نقل کر رہے ہیں جو لال مسجد کی ویب سائیٹ پر ۲۶ مارچ کی پریس ریلیز کے حوالے سے موجود ہے:

''لال مسجد کے طلبہ نے فحاشی و عریانی اور بدکاری کے اڈوں کے خلاف اپنی مہم تیز کرتے ہوئے

مختلف بازاروں اور مختلف علاقوں کے دورے شروع کر دیے جس میں میلوڈی' آبپارہ و دیگر مارکیٹیں شامل ہیں۔طلبہ نے ویڈیو سنٹروں پہ جا کر ان کو پیار ومحبت سے اس کام کو چھوڑ نے کے لیے کہا تو الحمدللہ سب نے اس کام کو چھوڑنے کا وعدہ کیا۔گزشتہ روز طلبہ کو آبپارہ کے کچھ لوگوں نے یہ اطلاع دی کہ یہاں آنٹی شمیم نامی خاتون اپنے گھر میں بدکاری کا اڈہ چلا رہی ہے' جس کے بعد مشورے سے یہ ترتیب قائم کی گئی کہ مردوں کا اندر جانا ٹھیک نہیں ہے' اس لیے کچھ طالبات بمع معلمات اندر جائیں گی اور طلبہ باہر کھڑے رہیں گے۔تفصیلات کے مطابق تقریباً دن کے ساڑھے بارہ بجے ایک گاڑی میں طلبہ اور دوسری گاڑی میں معلمات بمع طالبات وہاں پہنچیں۔طلبہ باہر کھڑے رہے۔ محلے کے آتے جاتے لوگوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ ہم تو اس اڈے سے بہت تنگ تھے اور محلے والوں نے یہ بات بھی بتلائی کہ یہاں اوسطاً روزانہ کوئی ۱۵۰ کے قریب مرد آتے ہیں اور کئی بار پولیس بھی اس پر چھاپہ مار چکی ہے لیکن وہ بے بس نظر آتی ہے' کیونکہ ان کے تعلقات بہت اونچے لوگوں سے ہیں۔معلمات اور طالبات جب اندر پہنچیں تو اندر کئی نوجوان لڑکیاں فل میک اپ میں تھیں اور برقعوں میں ملبوس اتنی خواتین کو دیکھ کر گھبراہٹ میں ایک لڑکی کمرے سے نیم برہنہ حالت میں نمودار ہوئی۔ طالبات نے اڈے کی نگران سے کہا یہ غلط کام کرنا ٹھیک نہیں ہے' یہ بہنیں اور بیٹیاں آپ کی ہیں' آپ نے ان لوگوں کو غلط کاموں میں ڈال رکھا ہے۔اس پر اس عورت نے کہا میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں' اور میں تم لوگوں کو دیکھ لوں گی۔اس پر طالبات نے کہا کہ وہ بھی سوائے اللہ کے کسی سے ڈرنے والی نہیں ہیں اور ہم تو آپ کو پیار ومحبت سے بات سمجھا رہے ہیں اور آپ دھمکیاں دے رہی ہیں۔اس نے ایک سوال یہ کیا کہ آپ کو کس نے بتایا؟ طالبات نے کہا کہ ہمیں محلے والوں نے بتایا ہے' تو اس نے کہا کہ میں محلے والوں سے نمٹ لوں گی۔ طالبات کے واپس آنے کے بعد اس محترمہ کی طرف سے معلمات کو دھمکی آمیز فون موصول ہونے شروع ہو گئے تو معلمات نے جواب دیا آپ اپنے اخلاق و کردار کو تبدیل کریں' ہم دھمکیوں سے مرعوب ہونے والی نہیں ہیں۔ہم سوائے اللہ کے اور کسی سے نہیں ڈرتیں۔اس محترمہ نے بعدازاں اہل محلّہ کو بھی دھمکیاں دیں۔لال مسجد کے طلبہ نے لال مسجد میں ایک شکایت سنٹر قائم کر دیا ہے اور ایسے ہی جامعہ حفصہ میں مستوارات کے لیے ایک شکایت سنٹر قائم کر دیا گیا ہے۔'' (www.lalmasjid.com)

یہ وہ پس منظر تھا جس میں آنٹی شمیم کو غالباً ۲۷ مارچ کو جامعہ حفصہ کی دو معلمات' ان کے دو مرد ساتھیوں اور ڈرائیور نے جامعہ حفصہ پہنچایا تھا۔

۲۹ مارچ: مبینہ ذرائع کے مطابق پولیس نے جامعہ حفصہ کی دو معلمات' ان کے دو مرد ساتھیوں

اور ڈرائیور کو آنٹی شمیم اغوا کیس میں گرفتار کرلیا، جبکہ جوابی کارروائی کرتے ہوئے لال مسجد کے طلبہ نے دو پولیس اہلکاروں اور پولیس کی دو گاڑیوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ رات گئے تک ضلعی حکومت اور لال مسجد کی انتظامیہ میں مذاکرات ہوتے رہے، جن کے نتیجے میں ضلعی حکومت نے ان دو معلمات، ان کے دو مرد ساتھیوں اور ڈرائیور کو رہا کر دیا جن پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے جی سکس اسلام آباد سے آنٹی شمیم نامی ایک خاتون، ان کی بیٹی، بہو اور چھ ماہ کی پوتی کو جامعہ حفصہ پہنچا دیا تھا۔ لال مسجد کے خطیب نے ان افراد کی رہائی کے بعد دو پولیس اہل کاروں اور موبائلز گاڑیوں کو چھوڑ دیا، لیکن آنٹی شمیم اور ان کی رشتہ دار خواتین کو فی الحال لال مسجد نے اپنی تحویل میں رکھا۔

۳۰ مارچ: مبینہ ذرائع کے مطابق بدکاری کا اڈا چلانے کے الزام میں محبوس شمیم اختر، اس کی بیٹی اور بہو کو اڑھائی دن کی یرغمالی کے بعد لال مسجد کی انتظامیہ نے برقعے پہنا کر رہا کر دیا۔ آنٹی شمیم کے سامنے تین آپشن رکھے گئے تھے۔ ایک یہ کہ ان کے خلاف کسی حکومتی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا اور جامعہ حفصہ کی طالبات ان کے خلاف گواہی دیں گی۔ دوسرا یہ کہ ان کے خلاف لال مسجد کی شرعی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ تیسرا یہ کہ وہ اپنے گناہ کا اقرار کرنے کے بعد توبہ کرلیں۔ آنٹی شمیم نے تیسرا آپشن قبول کرلیا اور ان کی توبہ کے بعد لال مسجد کی انتظامیہ نے انہیں رہا کر دیا۔ آنٹی شمیم نے رہائی کے بعد بیان دیا کہ انھوں نے جرم کا اقبال اپنی بیٹی اور بہو کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ علاوہ ازیں تھانہ آبپارہ کے ڈیوٹی آفیسر کے بیان کے مطابق لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز غازی اور نائب خطیب مولانا عبدالرشید غازی سمیت اسّی نامعلوم طلبہ وطالبات کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا۔

۳۱ مارچ: مبینہ ذرائع کے مطابق لال مسجد کے خطیب نے اپنے خطابِ جمعہ کے دوران درج ذیل مطالبات کیے: حکومت فوری طور پر نفاذِ شریعت کا اعلان کرے، ورنہ آئندہ جمعہ لال مسجد میں منعقدہ نفاذِ شریعت کانفرنس میں ہم خود اس کا اعلان کریں گے۔ حکومت عریانی و رفحاشی کے اڈے بند کرے اور اسلامی نظام نافذ کر کے فحاشی کے مرتکب افراد کو بیس بیس کوڑے لگائے، ورنہ لال مسجد میں قاضی عدالت میں ان پر حد لاگو کی جائے گی۔ بہت صبر کیا، مر جائیں گے، لیکن فحاشی کے اڈے نہیں چلنے دیں گے۔ نائب خطیب جناب عبدالرشید غازی کا بیان آیا کہ آنٹی شمیم سے پورا محلّہ تنگ تھا، آنٹی شمیم کے خلاف تقریباً اڑھائی سو معززین محلّہ نے میڈیا کو بیانات دیے۔

یکم اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق جامعہ حفصہ کی طرف سے اسلام آباد میں ویڈیو اور سی ڈیز کا کاروبار کرنے والے مالکان کو اس کاروبار کے تبدیل کرنے پر معاوضے کی پیش کش کی گئی۔ علاوہ ازیں ایک نجی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے لال مسجد کے خطیب جناب عبدالعزیز غازی نے کہا: آنٹی شمیم اس علاقے میں تقریباً دس برس سے کاروبار چلا رہی تھی، جامعہ حفصہ کی طالبات اس کو سمجھانے کے لیے گئی تھیں، لیکن اس کا ردّعمل ایسا تھا کہ وہ اس کو اٹھا کر لے آئیں۔ انھوں نے مزید یہ کہا کہ حکومت

طالبات کے لائبریری پر قبضے کے معاملے کو بہت اچھال رہی ہے‘ اُس وقت کیا ہوا تھا جب ٹونی بلیئر کے اس بیان پر کہ ’’حکومت مدرسوں کے بارے میں کچھ کرے‘‘ دوسرے ہی روز پچاس کمانڈوز طالبات کے مدرسے میں گھس آئے‘ بعدازاں طالبات پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا‘ انہیں زمین پر لٹا کر ڈنڈے اور ٹھڈے مارے گئے؟

۴/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق لال مسجد کے نائب خطیب مولانا عبدالرشید غازی نے گوجرانوالہ سے آنے والے علماء کے ایک وفد سے خطاب کے دوران سختی سے اس افواہ کی تردید کی کہ عدلیہ کے بحران سے توجہ ہٹانے کے لیے جامعہ حفصہ کا ایشو کھڑا کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عدلیہ کا بحران مارچ میں پیدا ہوا جبکہ جامعہ حفصہ کا مسئلہ اوائل جنوری سے چلا آرہا ہے۔

۷/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق جناب پرویز مشرف نے اپنے ایک بیان میں کہا: لال مسجد والے غیر اسلامی کارروائیاں چھوڑ دیں‘ ڈنڈا بردار آگئے تو ملک میں لاقانونیت پھیل جائے گی‘ ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے‘ لال مسجد والے اپنا بند ذہن کھولیں‘ دعا ہے اللہ انھیں ہدایت دے۔ جناب جاوید احمد غامدی نے بیان دیا: علماء داعی ہیں قاضی نہیں‘ شرعی عدالت کا قیام خلافِ دین ہے۔ جناب پرویز الٰہی کا درج ذیل بیان اخبارات میں شائع ہوا: لال مسجد کا معاملہ مذاکرات سے حل کرنا چاہیے‘ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی طالبات قانون ہاتھ میں نہ لیں‘ قوانین بنانا اور انہیں نافذ کرنا ریاست کا کام ہے۔ جناب قاضی حسین احمد نے بیان دیا: شریعت کورٹس ہر جگہ موجود ہیں‘ خانہ جنگی چاہتے ہیں اور نہ ریاست کے اندر ریاست چاہتے ہیں‘ ہم پاکستان کو استعماری ایجنٹوں سے آئینی اور قانونی طور پر آزاد کرائیں گے۔

۸/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق حکومت نے لال مسجد کی ویب سائیٹ پر پابندی لگا دی۔ جناب پرویز مشرف کی ایماء پر جناب شجاعت حسین لال مسجد کی انتظامیہ سے مذکرات کے لیے گئے‘ تقریباً دو گھنٹے تک یہ مذاکرات جاری رہے‘ دونوں فریقین اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ نیویارک سے شائع ہونے والے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے لال مسجد کی انتظامیہ نے اپنے ایک بیان میں کہا: ہم ایسی عدالت سے انصاف کی امید نہیں رکھتے جس کے سربراہ کو سڑکوں پر بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا‘ جس کا سربراہ خود انصاف مانگتا پھر رہا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: جامعہ حفصہ کی سات ہزار خواتین میں سے سترفی صد کا تعلق شمالی علاقہ جات سے ہے اور وہ کلاشنکوف چلانا جانتی ہیں۔

۹/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق وزیر داخلہ جناب آفتاب احمد شیر پاؤ نے ایک نجی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: حکومت کا موقف ہے کہ معاملہ پر امن طریقے سے حل ہو۔ جامعہ حفصہ کی طالبات کے والدین کو متنبہ کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے ایک اشتہاری مہم چلانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ دوسری طرف سے لال مسجد کے نائب خطیب عبدالرشید غازی کی طرف سے اعلان ہوا: ہم نے مذاکرات کے دروازے بند نہیں کیے۔

۱۰/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق جناب پرویز مشرف نے کہا: کالے کوٹوں اور کالے برقعوں کو اکٹھا نہیں ہونے دیں گے۔ صدارتی کیمپ آفس راولپنڈی میں حکومتی عہدیداران کے اہم اجلاس میں کیے گئے فیصلے کے دوران یہ کہا گیا: لال مسجد کی انتظامیہ کے خلاف میڈیا مہم شروع کی جائے۔ وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف قاضی نے بیان دیا: جامعہ حفصہ سرکاری زمین پر قبضہ کر کے بنایا گیا ہے' فوری خالی کرائیں گے۔

۱۱/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق جناب چوہدری شجاعت نے ایک دفعہ پھر منگل کی شب جامعہ حفصہ کا دورہ کیا۔ یہ مذاکرات تقریباً اڑھائی گھنٹے جاری رہے جن کے نتیجے میں حکومت نے سات شہید کی گئی مساجد کی دوبارہ تعمیر کی یقین دہانی کرائی۔ علاوہ ازیں دونوں بھائیوں نے اُس وقت تک چلڈرن لائبریری پر قبضہ برقرار رکھنے کا اعلان کیا جب تک حکومت شریعت کو نافذ کرنے کی یقین دہانی نہیں کراتی۔

۱۲/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق وزیر اعظم جناب شوکت عزیز کی صدارت میں وفاقی کابینہ کا اجلاس تقریباً پانچ گھنٹے تک جاری رہا۔ وفاقی وزیر برائے بندرگاہ و جہاز رانی جناب بابر غوری' وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف اور وزیر خارجہ جناب خورشید قصوری کا کہنا تھا کہ لال مسجد کے خلاف فوراً ایسا ایکشن لیا جائے جس سے یہ معاملہ ختم ہو جائے' جبکہ بعض دوسرے وزراء جن میں وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق' وزیر داخلہ جناب آفتاب احمد شیر پاؤ اور جناب ہمایوں اختر شامل ہیں' کا بیان تھا کہ معاملہ مذاکرات کے ذریعے ہی حل ہونا چاہیے۔ جبکہ دوسری طرف آئی این پی کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو کے دوران مولانا عبدالعزیز غازی نے کہا: ایم ایم اے والے سرحد میں اپنی حکومت کے باوجود اسلامی نظام نافذ نہیں کر سکے' وہ ہماری مدد کیا کریں گے؟ ایم ایم اے والے جمہوریت کے ذریعے اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں جبکہ ہم جہاد کے ذریعے۔ پانچ لاکھ کے قریب استحصالی ٹولے نے سترہ کروڑ عوام کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ جب تک اسلامی نظام نافذ نہیں ہوتا چلڈرن لائبریری پر اپنا قبضہ ختم نہیں کریں گے۔ چوہدری شجاعت سے کہا ہے کہ ہم ریڈیو پر اپنا موقف پیش کرنا چاہتے ہیں تا کہ عوام الناس کو معلوم ہو کہ ہمارا موقف کیا ہے۔ ہم پرویز مشرف کے نہ تو خلاف ہیں اور نہ ہی ہماری ان سے کوئی دشمنی ہے' البتہ ہمارے خلاف آپریشن آپریشن کی رٹ لگانے کی وجہ سے ہم نے فدائی حملوں کی بات کی تھی۔ ہم نے ریاست کے اندر ریاست قائم نہیں کر رکھی بلکہ پاکستان میں ایس ایچ او سمیت ہر چھوٹے بڑے افسر نے ریاست کے اندر اپنی ایک ریاست قائم کر رکھی ہے۔ مجھ پر ایجنسیوں کا بندہ ہونے کے الزامات محض الزامات ہیں' میں صرف اللہ کا بندہ ہوں۔

۱۳/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق وفاقی وزیر تعلیم جناب جاوید اشرف نے کہا: دینی مدارس میں قبضہ کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ وفاق المدارس کے علماء نے وفاقی وزیر برائے مذہبی امور

جناب اعجاز الحق کے ساتھ کی گئی ایک میٹنگ میں کہا: اگر لال مسجد کے خلاف آپریشن کیا گیا تو علماء لال مسجد کا ساتھ دیں گے۔

۱۴/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق لال مسجد کے نائب خطیب مولانا عبدالرشید غازی نے کہا: چوہدری شجاعت سے مذاکرات کے اختتام تک شرعی عدالت غیر فعال رہے گی۔ جبکہ مولانا عبدالعزیز غازی نے اپنے جمعہ کے خطبے میں کہا: اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے پرامن تحریک چلائیں گے‘ اسلامی نظام کے نفاذ کے موقف سے دستبردار نہیں ہوں گے‘ ہماری جدوجہد باطل نظام کے خلاف ہے‘ اگر پرویز مشرف اسلامی نظام نافذ کرتے ہیں تو ان کی جوتیاں اٹھانے کو تیار ہیں۔ ڈنڈے اور تیزاب کی بات ہم نے نہیں کی‘ ڈنڈا تو وہ استعمال کررہے ہیں جنہوں نے وزیرستان میں تباہی پھیلائی۔ انہوں نے مزید کہا کہ چوہدری شجاعت کا رویہ مثبت ہے لیکن اعجاز الحق آپریشن کی بات کرتے ہیں۔

۱۵/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق جامعہ بنوری ٹاؤن میں ایک علماء کنونشن کے اختتام کے موقع پر وفاق المدارس کے جنرل سیکریٹری مولانا حنیف جالندھری صاحب نے کہا: جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے معاملے میں حکومت ہوش کے ناخن لے اور کسی انتہائی اقدام سے گریز کرے۔ لال مسجد کے نائب خطیب جناب عبدالرشید غازی کی طرف سے بیان اخبارات میں شائع ہوا: کلاشنکوفی شریعت نافذ کی اور نہ ہی شٹل کاک برقعے کے علمبردار ہیں۔ علاوہ ازیں بہارہ ٹاؤن اسلام آباد کے علاقے میں عمران ویڈیو شاپ کے مالک نے بعض نامعلوم طلبہ کے دباؤ پر پندرہ سو ویڈیوز اور سی ڈیز جلا دیں۔

۱۶/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق متحدہ قومی موومنٹ کے کارکنوں نے کراچی میں لال مسجد اسلام آباد میں قاضی عدالت کے قیام کے خلاف مظاہرہ کیا۔ متحدہ کے سربراہ جناب الطاف حسین نے لندن سے اس ریلی سے ٹیلی فونک خطاب کرتے ہوئے کہا: حکومت اور مشرف نے مذہبی انتہا پسندوں کے خلاف فوری کارروائی نہ کی تو پھر دمادم مست قلندر ہوگا۔ خواتین پر تیزاب پھینکنے والے ہاتھ کاٹ دیں گے۔ قاضی کی ملین مارچ کی حسرت ہم نے پوری کردی۔ لال مسجد والے ملک کو سولہویں صدی میں لے کر جانا چاہتے ہیں جبکہ ہم اکیسویں صدی میں۔ انتہا پسندوں سے اسلام آباد سہما ہوا ہے‘ عوام کلاشنکوف اور ڈنڈا بردار شریعت کے خلاف ہیں۔ خواتین کو ڈرائیونگ سے روکا جارہا ہے‘ ملازمت پیشہ خواتین کے لیے کام کرنا مشکل بنا دیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف لال مسجد کی انتظامیہ نے الطاف حسین کے لگائے گئے الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا: کلاشنکوفی اور لسانی سیاست کے خالق کو کروڑوں عوام جانتے ہیں‘ الطاف حسین کے دامن پر ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون کے دھبے لگے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ لاشوں کی سیاست کرنے والوں کو قرآن کی تشریح کا کوئی حق حاصل نہیں۔ انہوں نے کہا جامعہ حفصہ یا لال مسجد کے کسی بھی طالب علم نے نہ تو اسلام آباد میں کسی خاتون کو گاڑی چلانے سے روکا ہے‘ نہ ہی کسی دکاندار کو دھمکی دی ہے اور نہ ہی کسی خاتون پر تیزاب پھینکنے کا واقعہ اسلام آباد میں ہوا ہے۔

۱۷/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق ایک فوجی ہیلی کاپٹر نے سوموار کے روز صبح ساڑھے دس بجے کے قریب جامعہ حفصہ اور اس سے متصل لال مسجد کے اوپر کافی دیر تک پرواز کی۔ لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالرشید غازی نے بی بی سی کو اپنے ایک انٹرویو کے دوران کہا: فوجی ہیلی کاپٹر تقریباً بیس منٹ تک لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی فضا میں پرواز کرتا رہا' ہیلی کاپٹر کی پرواز بہت نیچی تھی اور اس میں بیٹھے ایک فوجی نے مدرسے کی تصویریں بھی اتاریں' علاوہ ازیں ہیلی کاپٹر سے طلبہ و طالبات پر کیمیائی گیس بھی پھینکی گئی۔ مولانا کا کہنا تھا کہ جب اس مسئلے میں چوہدری شجاعت سے بات ہوئی تو انہوں نے اس واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا اور واقعے کی تحقیقات کرانے کی یقین دہانی کرائی۔

۱۸/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق لال مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے یہ بیان اخبارات میں آیا: زہریلی گیس سے جامعہ حفصہ کی پانچ سو معلمات و طالبات چوبیس گھنٹے گزرنے کے باجود ابھی تک متاثر ہیں' جبکہ بعض طالبات کیمیائی گیس کے اثرات سے بے ہوش بھی ہوئیں۔

۲۰/اپریل: وفاق المدارس العربیہ کی مجلس عاملہ کی دو روزہ میٹنگ کے بعد ایک اعلامیہ جاری کرتے ہوئے حکومت پاکستان سے درج ذیل مطالبات کیے گئے: حکومت جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے مطالبات کو منظور کرے' ملک میں اسلامی نظام نافذ کرے' گرائی جانے والی مساجد کو دوبارہ تعمیر کروائے' بدکاری اور فحاشی کے اڈے ختم کرے۔ اس اعلامیہ کے مطابق مجلس عاملہ نے جامعہ حفصہ کے مطالبات کو درست قرار دیا لیکن انہوں نے کہا کہ جامعہ حفصہ کی طالبات اور لال مسجد کی انتظامیہ کا طریق کار غلط ہے۔

۲۲/اپریل: وفاق المدارس العربیہ کی مجلس عاملہ نے اپنے ایک اجلاس میں جامعہ حفصہ اسلام آباد اور لال مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے اسلامی نظام کے نفاذ' اسلام آباد میں گرائی جانے والی مساجد کی دوبارہ تعمیر' بدکاری اور فواحش کے اڈے ختم کرنے اور نام نہاد تحفظ حقوقِ نسواں ایکٹ کی خلافِ اسلام دفعات کی منسوخی کے مطالبات کی حمایت کی ہے۔ مجلس عاملہ کی طرف سے جاری کردہ ایک اعلامیہ میں یہ بھی کہا گیا کہ وہ ملک میں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری' اسلامی اَقدار و روایات کے فروغ اور منکرات و فواحش کے سدباب کے لیے پرامن اور دستوری جدوجہد پر یقین رکھتی ہے۔

۲۳/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق وزیر اعظم شوکت عزیز کی زیر صدارت ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کو متبادل جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک نجی ٹی وی کی رپورٹ کے مطابق جب صدر پرویز مشرف کرنل کے عہدے پر فائز تھے تو وہ لال مسجد کے قریب رہتے تھے اور جامعہ فریدیہ میں آتے تھے۔ ان کے والد سید مشرف مدرسے میں کھانا بھی بھجواتے تھے۔

۲۴/اپریل: لال مسجد کے نائب خطیب نے بتایا کہ اظہر اقبال قوم اعوان جو کہ جہلم شہر کا رہائشی ہے اور ضلع ناظم کا خاص دوست اور پولیس کا ایجنٹ ہے' اس نے محمد اسلم نامی آدمی کے بیٹے کو شراب نوشی کی عادت ڈالی اور اس کی بیوی کو چرس کے الزام میں جیل بھجوا دیا اور گھر میں موجود اس کی تین بیٹیوں

میں سے ایک بیٹی سلمٰی (عمر ۱۷سال) کو ماں سے ملوانے کے بہانے جیل لے گیا اور اس کو وہاں نیند کی گولیاں کھلا کر بے ہوشی کے عالم میں اس سے زیادتی کی اور اس کی ویڈیو فلم بھی بنا ڈالی۔ بعد ازاں اس شخص نے اپنے بھتیجے عمران عرف مانی کے ساتھ مل کر اس لڑکی کی دوسری بہن ثمینہ (عمر ۱۶سال) کو بھی اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ ان بہنوں نے پولیس سے رابطہ کرنے کی بجائے لال مسجد میں قائم شکایت سنٹر میں اپنی شکایت درج کرا دی جس پر لال مسجد کی انتظامیہ نے دونوں خواتین کے ساتھ زیادتی کا مقدمہ بطور ٹیسٹ کیس حکومت کی طرف بھجوا دیا اور کہا کہ خلافِ توقع نتائج کی صورت میں اس کا فیصلہ لال مسجد کی شرعی عدالت اور ملک بھر کے علماء کریں گے۔

۲۵/اپریل: اخباری اطلاعات کے مطابق جناب چودھری شجاعت کی لال مسجد کے خطیب و نائب خطیب سے دو گھنٹے کی ملاقات ہوئی، جس کے بعد جناب چوہدری شجاعت نے بیان دیا کہ لال مسجد میں کوئی اسلحہ نہیں ہے اور میری ملاقات لال مسجد کی طالبات سے ہوئی ہے' میں ان سے بہت متأثر ہوں۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ جامعہ حفصہ میں آپریشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ جہلم ریپ کیس کے ملزمان کے خلاف مقدمہ اسلام آباد میں درج ہوگا اور ایس ایچ او جہلم کو اسلام آباد طلب کر لیا گیا ہے۔

۲۶/اپریل: اخباری بیانات کے مطابق چوہدری شجاعت نے وزیر اعظم شوکت عزیز سے ملاقات کے دوران کہا کہ جامعہ حفصہ کا معاملہ حل کی طرف بڑھ رہا ہے' ہم نے ان کے مطالبات مان لیے ہیں اور انہوں نے ہمارے مطالبات مان لیے ہیں۔ علاوہ ازیں پولیس تھانہ سول لائن جہلم نے اظہر اقبال اور عمران عرف مانی کے خلاف مقدمہ درج کر کے اظہر اقبال کو حراست میں لے لیا' جبکہ عمران عرف مانی پہلے ہی سے شراب نوشی کے جرم میں جیل میں تھا۔

۲۸/اپریل: اخباری بیانات کے مطابق لال مسجد کے خطیب نے خطابِ جمعہ میں کہا کہ حکومت اسلامی نظام نافذ کر دے تو وہ چلڈرن لائبریری تو کیا جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ بھی ان کے حوالے کر دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس مسجد سے چالیس سال سے یہ آواز بلند کی جا رہی ہے کہ ملک میں خلافت راشدہ کا نظام قائم کیا جائے اور پچھلے تین ماہ سے اس مطالبے میں زور آ گیا ہے۔

۲۹/اپریل: مبینہ ذرائع کے مطابق وزیر اعظم شوکت عزیز نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ ہمیں دینی مدارس پر فخر ہے' دینی مدارس کے حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی ضرورت نہیں ہے' مدارس تعلیمی شعبے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں' بعض مدارس کے بارے میں غلط فہمیاں دور کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۹/اپریل: اخباری اطلاعات کے مطابق آنٹی شمیم نے اپنے حالاتِ زندگی اور گاہکوں کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا اعلان کیا اور اس کتاب کے شائع کرنے کی ذمہ داری آکسفورڈ یونیورسٹی

برطانیہ نے لے لی۔ میڈم شمیم نے کہا کہ بعض ادارے مجھے قتل کروا کے اس کی ذمہ داری لال مسجد کے خطیب و نائب خطیب پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ایک حکومتی شخصیت نصر اللہ دریشک کے گھر پر ایک عشائیے میں بعض اراکین اسمبلی، سپیکر قومی اسمبلی جناب امیر حسین اور وزیر اعظم شوکت عزیز نے آنٹی شمیم کے اس بیان اور اس کے نتائج پر بحث کی۔ ایک رکن صوبائی اسمبلی کے بیان کے مطابق اس کتاب کے شائع ہونے سے بہت سے اراکین اسمبلی کی ازدواجی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی ہیں بلکہ بہت سوں کو طلاق کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔

۲ مئی : امامِ کعبہ نے وفاقی وزیر اعجاز الحق سے سعودی عرب میں ملاقات کے دوران کہا کہ پاکستان میں خودکش حملے کرنے والے گمراہ ہیں۔ اسلام سرکاری یا کسی کی ذاتی زمین پر قبضہ کر کے مسجد یا مدرسہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ حکومت کے ہوتے ہوئے کوئی فرد اپنی شرعی عدالت قائم نہیں کر سکتا۔ یہ حکمرانوں کی ذمہ داری ہے، اگر وہ اسے پورا نہیں کرتے تو اللہ کو جوابدہ ہوں گے۔ جبکہ دوسری طرف لال مسجد کے نائب خطیب نے یہ بیان دیا کہ امامِ کعبہ کو حقائق کے منافی معلومات فراہم کی گئیں، چودھری شجاعت معاملہ کو حل کرنا چاہتے ہیں جبکہ اعجاز الحق اس کو الجھا رہے ہیں۔

یہ حکومت اور لال مسجد کی انتظامیہ کے مابین ہونے والے تنازع کی ایک مختصر واقعاتی روئیداد ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ لال مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے کیے گئے کون سے اقدامات درست تھے اور کون سے غلط، ہم اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر قارئین کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں شرعی رہنمائی بیان کیے دیتے ہیں اور اس مسئلے میں کسی حتمی رائے اختیار کرنے کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

معروف و منکر کا مفہوم اور اس کا تعین

اگر ہم آسان اور مختصر الفاظ میں قرآنی اصطلاح ''معروف و منکر'' کا مفہوم بیان کریں تو وہ یہ ہے کہ معروف سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے، نیز فطرتِ سلیمہ اور عقل صحیح بھی اس کے کرنے کا مطالبہ کرے اور وہ مسلم معاشروں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہو۔ جبکہ ہر وہ بات جس سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع کیا ہو منکر ہے، نیز فطرت سلیمہ اور عقل صحیح بھی اس کے کرنے کو ناپسند کرتی ہو اور مسلم معاشروں میں بھی اس کو ناپسند کیا جائے۔ معروف و منکر کا تعین اصلاً شریعت کرتی ہے۔ کیا چیز معروف ہے اور کیا منکر ہے، اس کا علم ہمیں شریعت سے حاصل ہو گا نہ کہ عقل و فطرت سے۔ البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ جس چیز کو ہماری شریعت نے معروف کہا ہے اس کو عقل صحیح اور فطرت سلیمہ کی بنیاد پر قائم ایک مسلم معاشرہ بھی پسند کرتا ہے اور جس چیز کو ہماری شریعت نے منکر کہا ہے اس کو عقل صحیح اور فطرت سلیمہ کی بنیاد پر قائم ایک مسلم معاشرہ بھی اجنبی سمجھتا ہے۔ اس بات کو امام ابن جریر طبریؒ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

أصل المعروف كل ما كان معروفا فعله جميلا مستحسنا غير مستقبح فی أهل الایمان باللّٰه و انما سمیت طاعة اللّٰه معروفا لأنه ممایعرفه أهل الایمان ولا یستنکرون فعله و أصل المنکر ما أنکره اللّٰه تعالی و رأوه قبیحا فعله ولذلک سمیت معصیة اللّٰه منکرا لأن أهل الایمان باللّٰه یستنکرون فعلها

(جامع البیان فی تفسیر آیات القرآن، سورة آل عمران: ۱۱۰)

''معروف کا اصل معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کا کرنا جانا پہچانا ہو اور وہ اہل ایمان کے نزدیک اچھا اور مستحسن ہو اور وہ اس کو قبیح نہ سمجھتے ہوں۔ اور اللہ کی اطاعت کو بھی معروف اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہے جنہیں اہل ایمان پہچانتے ہیں اور اس کے کرنے کو ناپسند خیال نہیں کرتے۔ اور منکر کی اصل یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ناپسند جانا ہو اور اہل ایمان بھی اس کے کرنے کو ناپسند خیال کرتے ہوں۔ اسی وجہ سے اللہ کی نافرمانی کو منکر کہتے ہیں کیونکہ اہل ایمان اس کے کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔''

اسی بات کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ میں بیان کیا:

ما رأ ی المسلمون حسنا فهو عند اللّٰه حسن و ما رأوا سیئا فهو عند اللّٰه سیّئ

(مسند احمد: جلد ٤' ص ٤٥٣)

''جس کو مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ اللہ کے ہاں بھی اچھا ہے' اور جس کو وہ برا سمجھیں وہ اللہ کے ہاں بھی برا ہے۔''

مختصر بات یہی ہے کہ عقل عام یا فطرتِ انسانی میں معروف و منکر کا علم حاصل کرنے کے لیے کوئی کسوٹی یا معیار نہیں ہیں بلکہ اصل معیار وحی ہے اور وحی نے معروف اور منکر کا تعین کر دیا ہے۔ وحی کے متعین کردہ ان تمام معروفات و منکرات کے معروف و منکر ہونے کی گواہی عقل صحیح اور فطرتِ سلیمہ پر مشتمل انسانی معاشرے بھی دیتے ہیں۔ اسی بات کو ایک اور انداز میں بیان کرتے ہوئے مشہور مفسر ابو حیان اندلسیؒ لکھتے ہیں:

فسر بعضهم المعروف بالتوحید و المنکر بالکفر و لا شک أن التوحید رأس المعروف وا لکفر رأس المنکر و لکن الظاهر العموم فی کل معروف مأمور به فی الشرع و فی کل منهی نهی عنه فی الشرع (البحر المحیط' سورة آل عمران: ۱۰٤)

''بعض اہل علم نے معروف کی تفسیر توحید سے اور منکر کی تفسیر کفر سے کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ توحید معروف کی بنیاد ہے اور کفر منکر کی جڑ ہے' لیکن بظاہر الفاظ میں عموم ہے' لہٰذا معروف سے مراد ہر وہ شے ہے جس کا ہماری شریعت میں حکم دیا گیا ہے اور منکر سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے ہماری شریعت میں منع کیا گیا ہے۔''

امام ابو بکر جصاصؒ فرماتے ہیں:

المعروف هو أمر الله ...... و المنكر هو ما نهى الله عنه(أحكام القرآن، سورة آل عمران، باب فرض الأمر بالمعروف)

''معروف سے مراد اللہ کا حکم ہے ...جبکہ منکر سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہو۔''

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

یدخل فی المعروف کل واجب و فی المنکر کل قبیح و القبائح هی السیئات و هی المحظورات کالشرک و الکذب و الظلم و الفواحش(العقیدة الاصفهانیة ، ص ۱۲۱ بحواله معروف ومنکر، ص۹۸)

''معروف میں ہر واجب داخل ہے اور منکر میں ہر برائی داخل ہے۔یعنی وہ باتیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے' جیسا کہ شرک' جھوٹ' ظلم اور بے حیائی کے کام ہیں۔''

امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:

انهم یأمرون بما هو معروف فی هذه الشریعة و ینهون عما هو منکر فالدلیل علی کون ذلک لشیء معروفا أو منکرا هو الکتاب و السنة(ارشاد الفحول، ص ٧٤ بحواله معروف منکر، ص١٠٦)

''وہ اس چیز کا حکم دیتے ہیں جو اس شریعت میں معروف ہے اور اس سے منع کرتے ہیں جو منکر ہے۔پس اس چیز کے معروف یا منکر ہونے کی دلیل قرآن وسنت ہی ہیں۔''

امام راغبؒ فرماتے ہیں:

المعروف اسم لکل فعل یعرف بالعقل أو الشرع حسنه و المنکر ما ینکر بهما (مفردات ، ص ٣٣١)

''معروف سے مراد ہر وہ فعل ہے جس کا اچھا ہونا عقل سے معلوم ہو یا شریعت اس کو اچھا کہے' اور منکر وہ ہے جسے عقل اور شریعت دونوں ناپسند کرتے ہوں۔''

ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جس کو ہماری شریعت نے معروف کہا ہے اس کو عقل صحیح اور فطرت سلیمہ پر مشتمل مسلم معاشرہ بھی معروف کہتا ہے اور جس کو ہماری شریعت نے منکر کہا ہے اس کو عقل صحیح اور فطرت سلیمہ پر مشتمل مسلم معاشرہ بھی منکر کہتا ہے۔اس لیے امام راغب نے معروف ومنکر کی تعریف میں عقل صحیح کو بھی داخل کر دیا۔

کیا بدعات منکرات میں شامل ہیں؟

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بدعات منکر کی تعریف میں داخل نہیں۔ہم ان حضرات کی توجہ ایک صحیح حدیث کی طرف دلانا چاہیں گے جس میں ایک صحابیٔ رسول ﷺ نے ایک بدعت کے لیے منکر کا لفظ استعمال کیا۔حضرت طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

أول من بدأ بالخطبة يوم العيد قبل الصلاة مروان فقام اليه رجل فقال: الصلاة قبل الخطبة ، فقال: قد ترک ما هنالک ، فقال أبو سعيد: أما هذا فقد قضى ما عليه ، سمعتُ رسولَ الله ﷺ يقول: ((مَنْ رَأَى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ، فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ ، فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ))

(صحيح مسلم' کتاب الايمان' باب کون النهى عن المنکر من الايمان)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لغت میں منکر کے لفظ میں بدعات بھی شامل تھیں' جبکہ ہمارے بعض نام نہاد ماہرین لغت کی عربی معلّٰی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بدعات کو منکرات میں شامل کیا جائے ، یاللعجب!

دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرق

دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں فرق ہے۔ دعوت کا مقصد پیغام رسانی اور ترغیب و ترہیب ہوتا ہے جبکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مقصد بھلائی کا فروغ اور برائی کو مٹانا ہے۔ علاوہ ازیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں نفاذ شریعت کی بحث بھی ہے' اس لیے ہر دو اصطلاحات میں بہت زیادہ فرق ہے۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض لوگ منکر اور معصیت کو ایک ہی سمجھتے ہیں' حالانکہ ان دونوں میں فرق ہے۔ منکر کا لفظ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ منکر میں معصیت کی نسبت کسی مسلم معاشرے کا ایک فعل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کا مفہوم اضافی طور پر پایا جاتا ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس فرق کو کئی مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ مثلاً ایک بچہ پیشاب پی رہا ہو تو ہم اس کے اس فعل کو معصیت نہیں کہیں گے کیونکہ وہ بلوغت سے پہلے شرعی احکام کا مکلّف نہیں ہے' لیکن اس کا یہ فعل منکر ضرور ہے' اس لیے اسے اس فعل سے روکا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی پاگل زنا کرنا چاہے تو وہ بھی مکلّف نہ ہونے کی وجہ سے معصیت کا مرتکب نہیں ہے' لیکن اس کا یہ فعل منکر ہے' لہٰذا اسے اس فعل سے روکا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم یا منکر خدا عمل قومِ لوط میں مبتلا ہو تو اگرچہ وہ شرعی احکام کا مکلّف نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس کو اس فعل سے روکنا نہی عن المنکر کے تحت آئے گا' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے فعل بد کے لیے ﴿وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ﴾ (العنکبوت:۲۹) کے الفاظ استعمال کیے۔ معلوم یہ ہوا کہ منکر میں ہر معصیت شامل ہے' لیکن ہر معصیت منکر نہیں ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ بچے یا پاگل یا غیر مسلم کے اس فعل کا منکر ہونا ہمیں شریعت ہی سے معلوم ہوا ہے' لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی نے کوئی ایسی چیز باقی نہیں چھوڑی جس کے معروف و منکر ہونے کے بارے میں عقل و فطرت کو حکم بنانے کی ضرورت محسوس ہو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب و اہمیت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر واجباتِ شرعیہ میں سے ایک اہم ترین واجب ہے' جس کے وجوب پر قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت شاہد ہیں۔ قرآن مجید میں کئی جگہ امت مسلمہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران)

''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے' انہیں معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے' اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

امام قرطبیؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

و 'مِن' فی قوله تعالی 'منکم' للتبعیض. و معناه یجب أن یکونوا علماء و لیس کل الناس علماء. و قیل لبیان الجنس والمعنی لتکونوا کلکم کذلک.

(الجامع لأحکام القرآن' سورة آل عمران: ۱۰۴)

''اور 'مِن' اللہ تعالیٰ کے قول 'مِنکُم' میں تبعیض کے لیے ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ ضروری ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے علماء ہوں اور تمام لوگ علماء نہیں ہیں۔ اور ایک دوسرا قول یہ ہے کہ 'مِن' بیانِ جنس کے لیے ہے' یعنی تم سب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرو۔''

اسی طرح بہت سی احادیث میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ کا فرمان اوپر بیان ہو چکا ہے:

((**مَنْ رَأَى مِنكُم مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ**))(صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب کون النهی عن المنکر من الایمان)

''جو بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے تبدیل کر دے، اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے (اسے روکے) اور اگر اس کی بھی استطاعت نہیں رکھتا تو اپنے دل سے (اسے برا سمجھے)۔''

اسی طرح علماء کا اجماع بھی اس بات کی صریح دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:

أکّد الله تعالی فرض الأمر بالمعروف و النهی عن المنکر فی مواضع من کتابه وبیّنه رسولُ الله ﷺ فی أخبار متواترة عنه فیه و أجمع السلف و فقهاء الأمصار علی وجوبه (أحکام القرآن' سورة المائدة' باب الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر)

''اللہ تعالی نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی فرضیت کو اپنی کتاب میں کئی جگہ تاکیداً بیان کیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کی فرضیت کو ان متواتر اخبار میں بیان کیا ہے جو کہ آپؐ سے مروی ہیں' اور علماء سلف اور تمام بلادِ اسلامیہ کے فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ فرض ہے۔''

امام نوویؒ لکھتے ہیں:

قد تطابق علی وجوب الأمربالمعروف و النھی عن المنکر الکتاب و السنة واجماع الأمة .... و وجوبه بالشرع لا بالعقل خلافا للمعتزلة

(شرح النووی مع صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، باب کون النھی عن المنکر من الایمان)

''امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرض ہونے پر کتاب وسنت اور اجماعِ امت سب ہی متفق ہیں...اور اس کا فرض ہونا شرعاً ہے نہ کہ عقلاً' جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے۔''

امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرضِ عین یا فرضِ کفایہ؟

علماء میں اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے جبکہ بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ یہ فرض عین ہے۔علماء کے ان اقوال میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے امام شاطبیؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔وہ فرماتے ہیں:

قد یصح أن یقال أنه واجب علی الجمیع علی وجه من التجوز لأن القیام بذلک الفرض قیام بمصلحة عامة فھم مطلوبون بسدھا علی الجملة فبعضھم ھو قادر علیھا مباشرة و ذلک من کان أھلا لھا والباقون و ان لم یقدروا علیھا قادرون علی اقامة القادرین فمن کان قادرا علی الولایة فھو مطلوب باقامتھا و من لا یقدر علیھا مطلوب بأمر آخر و ھو اقامة ذلک القادر و اجبارہ علی القیام بھا

(الموافقات ، جلد ۱، ص۱۷۸ تا ۱۷۹، بحواله معروف و منکر، ص ۷٤)

''یہ کہنا مجازاً صحیح ہوگا کہ وہ (یعنی فرضِ کفایہ) سب پر ہی فرض ہے' کیونکہ اس فرض کو قائم کرنا درحقیقت دین کی ایک عمومی مصلحت کو پورا کرنا ہے اور اس عمومی مصلحت کے پورا کرنے کا مطالبہ سب مسلمانوں سے ہے۔پس بعض تو اس فرض کفایہ کو خود انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں اس فرض کی ادائیگی کی اہلیت ہو' جبکہ باقی افراد اگرچہ اس فرض کی ادائیگی پر تو قادر نہیں ہیں لیکن وہ اس فرض کی قدرت رکھنے والوں کو اس فرض کی ادائیگی کے لیے کھڑا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔پس جو شخص اس فرض کی ادائیگی پر قادر ہو تو اس سے اس فرض کی اقامت مطلوب ہے اور جو اس فرض کی اقامت پر قادر نہ ہو تو اس سے ایک اور چیز مطلوب ہے اور وہ یہ کہ وہ اس فرض کی ادائیگی کی قدرت رکھنے والے کو اس فرض کی اقامت کے

لیے کھڑا کرے اور اسے اس فرض کے قائم کرنے پر مجبور کرے۔''

پس یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی استطاعت اور قدرت رکھتے ہیں ان پر اس فریضے کی ادائیگی فرض عین ہے' جبکہ باقی افراد کا فرض یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی استطاعت وقوت رکھنے والوں کو اس فرض کی ادائیگی پر مجبور کریں۔ اس اعتبار سے امام شاطبیؒ کے نزدیک اس فریضے کی اقامت میں تمام لوگ شامل ہوں گے۔

یہ واضح رہے کہ جو صاحب استطاعت ہے اس کے حق میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

و هو فرض على الكفاية و يصير فرض عين على القادر الذى لم يقم به غيره

(الحسبة فى الاسلام' ص ۳۷ بحواله معروف و منكر، ص ۸۸)

''یہ فرض کفایہ ہے لیکن اس شخص پر یہ فرض عین ہو جاتا ہے جو اس پر قادر ہو' جبکہ اس کے علاوہ اس فرض کو کوئی اور انجام بھی نہ دے رہا ہو۔''

اس اعتبار سے حدود و تعزیرات کا نفاذ اصحابِ اقتدار اور امراء پر فرضِ عین ہے' کیونکہ اس فریضہ کی ادائیگی پر صرف یہی لوگ قادر ہیں۔ اسی طرح اگر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ کوئی بھی انجام نہ دے رہا ہو تو یہ بھی اصحابِ اقتدار پر فرضِ عین ہو گا۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شرطِ عدالت

بعض علماء نے کہا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے عدالت شرط ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی معروف پر عمل پیرا ہو اور منکر سے رو کے۔ کسی حد تک یہ شرط لگانا صحیح ہے' کیونکہ قرآن نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہیں لیکن خود نیکی نہیں کرتے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾(البقرة:٤٤)

''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنی جانوں کو بھول جاتے ہو؟''

لیکن یہ کہنا کہ جو شخص کسی معروف کا تارک ہو یا کسی منکر کا مرتکب ہو تو اس پر سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے' کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:

من لم يفعل سائر المعروف و لم ينته سائر المناكير فان فرض الأمر بالمعروف و النهى عن المنكر غير ساقط عنه(أحكام القرآن' سورة آل عمران' باب فرض الأمر بالمعروف و النهى عن المنكر)

''جو تمام معروفات پر عمل پیرا نہ ہو اور نہ ہی تمام منکرات سے بچا ہوا ہو تو اس سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ساقط نہیں ہوتا۔''

سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں:

لو کان المرء لا یأمر بالمعروف و لا ینھی عن ا لمنکر حتی لا یکون فیه شيء ما أمر أحد بمعروف و لا نھی عن منکر (تفسیر ابن کثیر‘ البقرۃ:٤٤)

’’اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ اُس وقت تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرے گا جب تک کہ اس میں کوئی منکر ہو تو اس طرح کوئی بھی کسی معروف کا نہ تو حکم دے سکتا ہے اور نہ ہی منکر سے منع کر سکتا ہے۔‘‘

امام مالکؒ سعید بن جبیرؒ کے اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں:

صدق من ذا الذی لیس فیه شيء (أیضاً)

’’سعید بن جبیرؒ نے سچ کہا ہے‘ کیونکہ کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے کہ جس میں کوئی نہ کوئی منکر نہ پایا جاتا ہو۔‘‘

امام ابن کثیرؒ اس مسئلے میں فرماتے ہیں:

و الصحیح أن العالم یأمر بالمعروف و ان لم یفعله و ینھی عن المنکر و ان ارتکبه (أیضاً)

’’صحیح بات یہ ہے کہ عالم معروف کا حکم دے گا اگرچہ وہ خود اس کو نہ کرے اور منکر سے منع کرے گا اگرچہ وہ خود اس کا مرتکب ہو۔‘‘

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا دائرۂ کار

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حوالے سے ایک چیز جو بہت ہی اہم ہے وہ یہ کہ اس کا دائرۂ کار کیا ہے۔ کیا یہ صرف ریاست کی ذمہ داری ہے یا عوام الناس اور معاشرے کا بھی اس فریضے کی ادائیگی میں کوئی کردار ہے؟ جمہور علماء کے نزدیک یہ فریضہ ریاست کے ساتھ ساتھ اس کے افراد اور عام معاشرے پر بھی عائد ہوتا ہے‘ جبکہ ہمارے ہاں بعض متجددین نے اس کے لیے ریاست یا اس کی اجازت کو بطور شرط بیان کیا ہے۔ لیکن یہ موقف قرآن و سنت اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ م یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (التوبۃ: ٧١)

’’مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں۔‘‘

قرآن کی اس آیت سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ عام ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی اور بھی بہت سی آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک عام فریضہ ہے‘ جس میں حکومت و ریاست اور عوام و علماء برابر کے شریک ہیں۔ ان آیات کو امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم

میں جمع کر دیا ہے۔ان میں سے ایک اور آیت ہم پیش کیے دیتے ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوٰٮھُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ ط﴾ (النساء:١١٤)

''ان کی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس نے صدقہ کرنے کا حکم دیا یا کسی معروف کا حکم دیا یا لوگوں میں اصلاح کا حکم دیا۔''

علاوہ ازیں علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف اصحابِ اقتدار کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ یہ عام مسلمانوں کے لیے بھی ثابت ہے۔امام نووی ؒ لکھتے ہیں:

قال العلماء ولا یختص الأمر بالمعروف و النھی عن المنکر باصحاب الولایات بل ذلک ثابت لأحاد المسلمین ، قال امام الحرمین: والدلیل علیه اجماع المسلمین ، فان غیر الولاۃ فی الصدر الأول و العصر الذی یلیه کانوا یأمرون الولاۃ بالمعروف و ینھوھم عن المنکر مع تقریر المسلمین ایاھم وترک توبیخھم علی التشاغل بالأمر بالمعروف والنھی عن المنکر من غیرولاۃ (شرح النووی مع صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب کون النھی عن المنکر من الایمان)

''علماء نے کہا ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اصحاب اقتدار کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ یہ عام مسلمانوں کے لیے بھی ثابت ہے۔امام الحرمین نے کہا ہے کہ اس بات کی دلیل مسلمانوں کا اجماع ہے کیونکہ صدر اول اور اس سے ملحق زمانوں میں عوام الناس حکمرانوں کو معروف کا حکم دیتے تھے اور منکر سے منع کرتے تھے' اور اس پر تمام مسلمانوں کی تقریر شاہد ہے۔علاوہ ازیں تمام مسلمانوں کا حکمرانوں کے علاوہ افراد کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مشغول ہو جانے پر کوئی انکار نہ کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ غیر حکمران کے لیے جائز ہے۔''

بعض حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف ریاست کا فریضہ ہے وہ اپنے اس موقف کے اثبات کے لیے قرآن کی درج ذیل آیت سے دلیل دیتے ہیں:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط﴾ (الحج:٤١)

''اور یہ (اہل ایمان) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں تو نماز کا اہتمام کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے' بھلائی کی تلقین کریں گے اور برائی سے روکیں گے''۔ (میزان: ص۲۱۲)

اس آیت کو اصحابِ اقتدار کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ قرآن کی اسی آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ألا انها ليست على الوالي وحده ولكنها على الوالي والمولى عليه(تفسير ابن كثير، سورة الحج: ٤١)

''خبردار! یہ صرف حکمران کے لیےنہیں ہے' بلکہ یہ حکمران اورعوام الناس دونوں پرفرض ہے۔''

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کواصحاب اقتدار کے ساتھ خاص کرنا ایک ایسی غیر منطقی اورخلافِ عقل بات ہےجس کا ردقرآن وسنت کی واضح وصریح نصوص کے علاوہ اجماع امت اورعقل عام سے بھی ہوتا ہے۔امام غزالیؒ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کوحکمرانوں یا ان کی اجازت کے ساتھ خاص کرنے والےافرادکاردکرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هذا الاشتراط فاسد، فان الآيات و الأخبار التى أوردناها تدل على أن كل من رأى منكرا فسكت عليه عصى اذ يجب نهيه أينما رآه وكيفما رآه على العموم ، فالتخصيص بشرط التفويض من الامام تحكم لا أصل له ...... استمرار عادات السلف على الحسبة على الولاة قاطع باجماعهم على الاستغناء عن التفويض بل كل من أمر بمعروف ، فان كان الوالى راضيا به فذاك و ان كان ساخطا له فسخطه له منكر يجب الانكار عليه ، فكيف يحتاج الى اذنه فى الانكار عليه؟ (احیاء العلوم' جلد٢' ص١٥١' ١٥٢)

''یہ شرط لگانا(کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیےحکومت کی اجازت ضروری ہے)ہی فاسد ہے' کیونکہ آیات اورروایات جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہےاس بات پردلالت کرتی ہیں کہ جس نے بھی کسی منکرکودیکھا اوراوراس پرسکوت اختیارکیا تواس نے اللہ کی نافرمانی کی' کیونکہ اس منکر سے روکنااس پرواجب تھا' چاہے جہاں بھی اس نے اس منکرکودیکھا ہواورجس حالت میں بھی دیکھا ہو۔پس اس عام حکم میں اس شرط کے ساتھ تخصیص پیداکرنا کہ نہی عن المنکر اُس وقت فرض ہوگا جبکہ امام کی اجازت ہو' بلادلیل ہے اوراس کی کوئی بنیادنہیں ہے..... سلف صالحین کا یہ مسلسل طرزِعمل کہ وہ حکمرانوں کا احتساب کرتے رہےاس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس فریضے کی ادائیگی کے لیے حکمرانوں کی طرف سے مأمور ہونا بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔پس جس نے بھی معروف کاحکم دیااورحکمران نےاس کو پسندکیا تو یہی چیز مطلوب ہے' اور اگرحکمران اس معروف کےحکم کرنے سے ناراض ہواتو حکمران کی یہ ناراضگی خودایسا منکر ہے جس کا انکارواجب ہے۔اس صورت میں یہ شخص حکمران سےصادرہونے والےاس منکر کے انکارکے لیےکیسےاس کی اجازت کامحتاج ہوگا؟''

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا دائرۂ عمل

ہم یہ بات ثابت کرچکے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ریاست اوراس کے افراددونوں کی

ذمہ داری ہے اور یہی موقف قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ فریضہ ادا کرتے وقت ایک ریاست اور عام شہری یا مسلمانوں کی تنظیم کے دائرہ عمل میں کچھ فرق ضرور ہوگا۔ لیکن اس فرق کے باوجود فرد اور ریاست دونوں کے لیے یہ دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ اس لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے دائرہ اختیار کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے' جیسا کہ بعض نام نہاد اسکالرز حضرات نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے یہ شرط عائد کی ہے کہ انسان صرف اسی جگہ یہ کام کرسکتا ہے جو اس کے دائرۂ اختیار میں ہو۔ قرونِ ثلاثہ میں عوام الناس اور علماء اپنے حکمرانوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہے' اور حکمران تو عوام الناس اور علماء کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتے۔ اسی طرح مسلم کی ایک روایت ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ اُمَةٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ، وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))

(صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب کون النھی عن المنکر من الایمان)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھ سے پہلی امتوں میں کوئی بھی ایسا نبی نہیں گزرا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کی امت میں سے کچھ اصحاب اور حواری نہ بنائے ہوں' جو اُس نبی کی سنت کو پکڑتے اور اس کی اقتدا کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد کچھ ناخلف قسم کے لوگ ان کے جانشین بنتے جو ایسی باتیں کہتے تھے جو وہ کرتے نہیں تھے' اور ایسے کام کرتے تھے جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ پس جو کوئی ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے' اور جو کوئی ان سے اپنی زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور جو کوئی ان سے اپنے دل سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے۔ اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

اس حدیث میں ناخلف اور نااہل حکمرانوں کے خلاف ہاتھ سے جہاد کو ایمان قرار دیا گیا ہے' حالانکہ حکمران ایک عام انسان کے دائرۂ اختیار میں داخل نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک حسن حدیث میں جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل جہاد کہا گیا ہے' اور یہ بھی زبان کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہی ہے۔

اگر تو کوئی شخص کسی منکر کا ارتکاب کر چکا ہو تو اس پر حد یا تعزیر جاری کرنے کا معاملہ حکومت یا امام کی ذمہ داری ہے' لیکن اگر کوئی شخص کسی معصیت یا منکر کو دیکھ رہا ہو تو اس دیکھنے والے کے لیے اس معصیت یا منکر کا ازالہ واجب ہوگا اگر وہ اس کے ازالے کی قدرت رکھتا ہو۔ امام ابوبکر جصاصؒ نے

اس مسئلے پر بڑی ہی مدلل گفتگو کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

و فی هذه الأخبار دلالة علی أن الأمر بالمعروف و النهی عن المنكر لهما حالان: حال یمكن فیها تغییر المنكر و ازالته ، ففرض علی من أمكنه ازالة ذلک بیده أن یزیله ، وازالته بالید تكون علی وجوه: منها أن لا یمكنه ازالته الا بالسیف و أن یأتی علی نفس فاعل المنكر فعلیه أن یفعل ذلک ، كمن رأی رجلا قصده أو قصد غیره بقتله أو یأخذ ماله أو قصد الزنا بامرأة أو نحو ذلک، وعلم أنه لا ینتهی ان أنكره بالقول أو قاتله بما دون السلاح فعلیه أن یقتله لقولهﷺ ((مَنْ رَأَی مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهِ)) فاذا لم یمكنه تغییره بیده الا بقتل المقیم علی هذا المنكر فعلیه أن یقتله فرضا علیه ...... وكذلک قال ابوحنیفة فی السارق اذا أخذ المتاع و سعک أن تتبعه حتی تقتله ان لم یرد المتاع ، قال محمد: قال ابوحنیفة فی اللص الذی ینقب البیوت: یسعک قتله.

(أحكام القرآن ' سورة آل عمران' باب فرض الأمر بالمعروف و النهی عن المنكر)

''ان احادیث مبارکہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ جس میں منکر کی تغییر اور اس کا ازالہ ممکن ہو۔ پس جو شخص اس منکر کو ہاتھ سے ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اس پر ہاتھ سے اس منکر کو ختم کرنا فرض ہے۔ اور کسی منکر کو ہاتھ سے ختم کرنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ اس منکر کا خاتمہ تلوار کے بغیر اور اس منکر کے فاعل کی جان لیے بغیر ممکن نہ ہو تو اس پر ضروری ہے کہ وہ ایسا کر گزرے۔ مثلاً ایک شخص اس کے یا کسی دوسرے شخص کے قتل کا ارادہ کر رہا ہے یا وہ اس کا مال چھیننا چاہتا ہے یا وہ کسی عورت سے زنا کرنا چاہتا ہے یا اس قسم کا کوئی اور کام کرنا چاہتا ہے تو یہ بات بھی معلوم ہو کہ اگر وہ اس شخص کو زبان سے منع کرے گا یا بغیر کسی ہتھیار کے اس سے لڑائی کرے گا تو باز نہیں آئے گا' ایسی صورت میں اس شخص کے لیے اس منکر کے ارتکاب کرنے والے کو قتل کرنا لازم ہے' کیونکہ اللہ کے رسولﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو بھی تم میں سے کسی منکر کو دیکھے تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے ختم کر دے''۔ پس جب اس منکر کی ہاتھ کے ساتھ تغییر اس منکر کے مرتکب کے قتل کیے بغیر ممکن نہ ہو تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس منکر کے مرتکب کو قتل کر دے... اسی طرح امام ابوحنیفہ نے اس چور کے بارے میں جو تمہارا مال لے جائے' کہا ہے کہ تیرے لیے گنجائش ہے کہ تو اس کا پیچھا کر اور اگر وہ تیرا مال نہ واپس کرے تو تو اس کو قتل کر دے۔ امام محمد نے کہا کہ امام ابوحنیفہ نے اس چور کے بارے میں جو گھروں میں نقب لگاتا ہے' کہا ہے: تیرے لیے اس کو قتل کرنے کی گنجائش ہے۔''

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

أجمع المسلمون فی ما ذكر ابن عبد البر أن المنكر واجب تغییره علی كل

من قدر عليه (تفسیر القرطبی' جلد٤' ص٤٩)

''ابن عبدالبر نے اس بات پر علماء کا جمع نقل کیا ہے کہ ہر اُس شخص پر منکر کی تغییر واجب ہے جو اس کی تغییر کی قدرت رکھتا ہو۔''

لیکن قدرت کے باوجود اگر نہی عن المنکر سے کسی بڑے منکر یا بعض دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتو علماء اس کو جائز قرار نہیں دیتے۔اس مسئلے پر امام ابن قیمؒ کی تحریر بڑی ہی خوبصورت ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں:

انکار المنکر أربع درجات الأولی : أن یزول و یخلفه ضده الثانیة أن یقل و ان لم یزل بجملته الثالثة أن یخلفه ما هومثله الرابعة أن یخلفه ما هو شر منه فالدرجتان الأولتان مشروعتان والثالثة موضع اجتهاد و الرابعة محرمة (اعلام الموقعین: جلد ٣'ص ١٥١)

''انکارِ منکر کے چار درجات ہیں: پہلا درجہ وہ ہے جس سے منکر ختم ہو جائے اور اس کی جگہ معروف قائم ہوجائے۔دوسرا درجہ یہ ہے کہ منکر کم ہوجائے اگرچہ مکمل ختم نہ ہو۔تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ منکر تو ختم ہو جائے لیکن اس کی جگہ ایک ویسا ہی منکر اور آ جائے۔اور چوتھا درجہ یہ ہے کہ اس منکر کے خاتمے کے بعد اس سے بھی بڑا اور بدترین منکر آ جائے۔پس پہلے دو درجے مشروع ہیں' جبکہ تیسرا درجہ اجتہاد کا میدان ہے' اور چوتھا درجہ حرام ہے۔''

شاید یہی آخری درجہ ہے جس کے حوالے سے علماء کی ایک کثیر تعداد جامعہ حفصہ اور لال مسجد کی انتظامیہ کے موقف کو تو درست لیکن طریق کار کو غلط قرار دیتی ہے' کیونکہ ان کے نزدیک اس طریق کار سے ایک بڑے شر کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔لیکن ہم اس پر اتنا کہہ کر اپنی اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا کہ اس منکر کے اس طرح خاتمے کے لیے جدوجہد کرنے سے کوئی بڑا منکر پیدا ہو گا یا نہیں' ایک اجتہادی امر ہے' جس میں اختلاف کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔**و اللّٰہ أعلم بالصواب!**

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (44)

تیونس

(Tunisia)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

تیونس : ایک نظر میں

پورا نام: الجمہوریہ التیونسیہ
رقبہ: 163,610 مربع کلومیٹر
آبادی: تقریباً ایک کروڑ
اوسط عمر: 74.66 سال
آبادی کی گنجانی: 158 فی مربع میل
دارالحکومت: تیونس (آبادی سترہ لاکھ)
زبانیں: عربی، فرانسیسی
مذہب : مسلمان 98 فیصد۔ عیسائی، یہودی اور دیگر دو فیصد
شرح خواندگی: 74.2 فی صد
کل قومی پیداوار: 68.23 ارب ڈالر سالانہ
فی کس آمدنی: 6900 ڈالر
افراطِ زر: 2.7 فیصد
قابل کاشت رقبہ: 17.86 فی صد
زراعت: زیتون، زیتون کا تیل، اجناس، ڈیری کی مصنوعات، ٹماٹر، مالٹا، چقندر، کھجور، بادام
صنعت: تیل، کان کنی (فاسفیٹ اور لوہے کی)، سیاحت، پارچہ بافی، جوتے، مشروبات
تیل کے ذخائر: 417 ملین بیرل

گیس کے ذخائر: 77.16 ارب کیوبک میٹر
برآمدات: 8.125 ارب ڈالر (پارچہ جات، مشینری، فاسفیٹ اور کیمیکلز، زرعی مصنوعات)
درآمدات: 10.5 ارب ڈالر (پارچہ جات، مشینری اور پرزہ جات، ہائیڈروکاربن، کیمیکلز، غذائی اشیاء)
تجارتی ساتھی: فرانس، اٹلی، جرمنی، سپین، لیبیا
بیرونی قرضہ: 14.39 ارب ڈالر
کرنسی: تیونسی دینار
ٹیلیفون: پونے بارہ لاکھ
ٹی وی سٹیشن: 26
ریلوے: 2152 کلومیٹر
سڑکیں: 18,992 کلومیٹر
بندرگاہ: شفق، بزرتی، گبیں، تیونس
ہوائی اڈے: 30
کل فوج: 40 ہزار
کاروں کی تعداد فی ہزار: 70
سالانہ فوجی اخراجات: 356 ملین ڈالر

تیونس المغرب کا سب سے چھوٹا ملک ہے۔ ملک کا نصف حصہ ریگستانی، بنجر اور پتھریلا پہاڑ ہے۔ تاہم اس کے ارضی خدوخال اور ٹوپوگرافی میں زبردست رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ طبعی خدوخال کے اعتبار سے تیونس کو بحیرۂ روم کا ساحلی میدان، مدّ وجزر کی وادی، خلیج تیونس کے قرب وجوار کا میدان، وسطی پہاڑ، اسٹیپی گھاس کے میدان اور جنوب مغربی ریگستان میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تیونس کی آب وہوا پر بحیرۂ روم کا گہرا اثر ہے۔ ساحل سے دور اندرونی علاقوں کی طرف جاتے ہوئے گرمی اور سردی کے درجۂ حرارت میں تفاوت بڑھ جاتا ہے۔

تاریخی پس منظر

تیونس ایک مسلم ملک کے علاوہ ایک شہر کا نام بھی ہے جو ملک کا صدر مقام ہے۔ اِس ملک کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ یہاں مسلسل نوسو سال تک بربر حکومت کرتے رہے۔ اسے فتح کرنے کے لیے عرب حملہ آور، جو جنوب مغرب سے آئے تھے، تقریباً نصف صدی تک یہاں کے بربر باشندوں اور بزنطی عمال کے خلاف جنگیں لڑتے رہے۔ بالآخر عقبہ بن نافع نے تیونس فتح کیا اور شہر قیروان کی بنیاد ڈالی۔ جب مسلمانوں کا مکمل تسلط ہوگیا تو بربر قبائل نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔

800ء سے 909ء تک بنو اغلب تیونس پر حکمرانی کرتے رہے۔ اس حکمران خاندان نے تیونس میں بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ امیر اگرچہ بظاہر خلیفہ بغداد کے ماتحت تھے، لیکن اصل میں کافی خودمختار تھے۔

909ء میں تیونس میں فاطمی خلافت قائم ہوگئی۔ بنو اغلب کے عہد میں مختلف مذاہبِ فقہ رائج ہوئے اور احادیثِ نبویؐ کی بڑی بڑی کتابیں تالیف ہوئیں۔ امام مالکؒ کی فقہ کو عروج حاصل ہوا۔ اُس وقت سے تیونس کا غالب مسلکِ فقہ یہی ہے۔

973ء سے تیونس پر بنوزید حکومت کرنے لگے۔ اُن کے عہد میں امراء کا تقرر ہمیشہ قاہرہ کے فاطمی خلفاء کرتے تھے۔ اس زمانے میں شمالی افریقہ نے ترقی وخوشحالی کا دور دورہ دیکھا۔

1200ء میں بنو مرابطین کو تیونس پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ ان کے بعد بنو حفص کی حکمرانی رہی، جو تقریباً 350 سال تک حکومت کرتے رہے۔ انہوں نے بھی مالکی فقہ کو اپنایا اور ترقی کی نئی منزلیں طے کیں۔ بنو حفص کے بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ ابو عمر عثمان تھا، جس نے 1453ء سے 1488ء تک حکومت کی۔ اس کا نام اس صدی کے سارے حکمرانوں کے ناموں پر چھایا ہوا ہے۔ ابو عمر عثمان کی وفات کے بعد حالات بہت خراب ہوتے چلے گئے۔ چند سال کے اندر اندر تین خلیفہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور اس طرح یہ عظیم الشان سلطنت ہسپانیہ کے حملے کے سامنے دم توڑ گئی، جو ترک بحری قزاقوں کے تعاقب میں ان علاقوں میں آنے لگے تھے اور رفتہ رفتہ ان پر قابض ہوگئے۔

بالآخر ستمبر 1574ء میں عثمانی فوجوں نے، جو قسطنطنیہ سے سنان پاشا کے بیڑے میں بھیجی گئی تھیں، تیونس کو فتح کرلیا اور اس طرح ہسپانوی قبضے کا خاتمہ کردیا۔ اس کے ساتھ ہی بنو حفص خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ سنان پاشا نے تیونس کو مستقل ترکی صوبہ قرار دے دیا اور اس کا ایک حاکم پاشا (گورنر) کے طور پر مقرر کیا۔ 1587ء میں اس صوبے کو براہِ راست بابِ عالی (مرکز) کے تحت لے لیا گیا۔

انیسویں صدی میں تیونس کی سیاسی حیثیت میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ جب 1830ء میں الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہوگیا تو اس کے اثرات تیونس پر بھی پڑے۔ تیونس نے نصف صدی تک اپنے

اندرونی نظام کی ترمیم وتجدید سے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی بے سود کوشش کی۔ اس کے لیے ایک طرف تو ڈھیلی ڈھالی عثمانی اختیارداری تھی اور دوسری طرف اس کے معاملات میں عیسائی حکومتوں کی دخل اندازی تھی، جو وہ اپنے قونصلوں کے ذریعے کرتی رہتی تھی۔ تیونس کی حکومت کو ان کے بین بین چلنا پڑتا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کا حقِ خوداختیاری، جس کی برطانیہ کی طرف سے تائید ہوتی تھی اور فرانس کی جانب سے مخالفت، صرف چند شاہی فرمانوں کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔

1881ء میں قطعی طور پر فرانس کے زیرانتداب آجانے سے تیونس کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں دس ہزار تیونسیوں نے فرانس کی خاطر جان دے دی۔ اس دور میں تیونس میں دوہری حکومت قائم رہی۔ ایک طرف تو نامی حکومت تھی جو محض روایتی تھی اور دوسری طرف فرانس کی حکومت تھی جو حقیقی تھی۔ فرانس نے تیونس کے بیرونی قرضے کی ادائیگی کی ضمانت بھی دی تھی، اس لیے برطانیہ اور اٹلی دونوں اس بات پر راضی ہوگئے کہ مالیاتی کمیشن توڑ دیا جائے۔ چنانچہ 1884ء میں اسے توڑ دیا گیا۔

1930ء میں فرانسیسی انقلاب کے خلاف آزادی کی تحریک شروع ہوئی اور ''حزبِ نو دستور'' وجود میں آیا۔ اگرچہ پہلی جنگ عظیم کے دوران ہی تحریک آزادی شروع ہوچکی تھی، جس نے جنگ کے بعد بڑا زور پکڑا، لیکن فرانس کب چاہتا تھا کہ اس کے یہ علاقے ہاتھ سے نکل جائیں۔ چنانچہ جب ''حزبِ نو دستور'' جس کا سب سے بڑا مقصد عوام تک پہنچنا اور انہیں منظّم کرنا تھا، وجود میں آیا تو حکومتِ فرانس نے ان پر سختی کی اور بہت سی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ دستور اور دستورِ نو دونوں کو ختم کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی تیونس اور متصلہ ممالک جنگ کی لپیٹ میں آگئے۔

1943ء میں قوم پرستوں نے دوبارہ سر اٹھایا تو انہیں پھر طاقت کے زور سے دبا دیا گیا، لیکن اس مرتبہ قوم پرستوں نے بڑے عزم واستقلال کا ثبوت دیا۔

1946ء کے بعد کچھ اصلاحات کی گئیں، مگر فرانسیسی حکومت کا ردِّعمل چونکہ بہت سست تھا اور قوم پرستوں کے مزاج کے مطابق نہ تھا، اس لیے ان کا جوشِ آزادی بڑھتا گیا۔ بالآخر 1954ء میں فرانس داخلی آزادی دینے پر آمادہ ہوگیا۔

1955ء، 20 مارچ کو تیونس آزاد ہوگیا اور حبیب بورقیبہ نئی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے منتخب ہوگئے۔ انہوں نے تیونس کو آزاد کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔

1957ء، جولائی میں عام انتخابات ہوئے اور ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ چنانچہ 25 جولائی کو تیونس کو ''ری پبلک'' قرار دے دیا گیا اور حبیب بورقیبہ کو صدر منتخب کیا گیا۔

1959ء میں ملک کو نیا دستور دیا گیا۔ 8 نومبر کو قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ اب ملک چودہ ولایتوں میں منقسم ہے۔ ہر ولایت کا حاکم والی کہلاتا ہے۔ اس کا معاون معتمد کہلاتا ہے۔

3

1967ء، جون، عرب اسرائیل جنگ میں شرکت کرنے سے تیونس نے اس لیے انکار کر دیا کہ اس طرح امریکہ سے اس کے تعلقات خراب ہو جاتے۔ اسلام پسند تحریک کو ''بنیاد پرست'' قرار دے کر دبانے کی کوشش کی گئی۔

1987ء میں حبیب بورقیبہ کو علالت کے باعث سبکدوش ہونا پڑا۔ ان کی جگہ زین العابدین بن علی کو صدر منتخب کیا گیا۔ ان کے عہد میں امریکہ کے خلاف جذبات برانگیختہ ہوئے۔ اسلام پسند تحریک کو تقویت ملی۔

1999ء، اکتوبر میں عام انتخابات ہوئے، جن میں صدر بن علی کو 99 فیصد ووٹ ملے، اگرچہ بنیادی انسانی حقوق کی سخت خلاف ورزی ہوئی۔

2000ء، مئی میں بلدیاتی الیکشن ہوئے۔ حزبِ اختلاف نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا، لیکن بن علی کی پارٹی کو 92 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔

2004ء، اکتوبر میں صدارتی انتخابات ہوئے جن میں بن علی کو کامیابی ملی۔ تاہم حزبِ اختلاف نے پھر وسیع پیمانے پر دھاندلی کی شکایت کی۔

بقیہ : مسجد اقصیٰ کی تاریخی اہمیت (حواشی)

(١) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ ووھبنا لداوٗد سلیمان......

(٢) تفسیر ابن کثیر ٦٤/٢۔ عن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

(٣) رواہ الطبرانی۔

(٤) سنن النسائی، کتاب المساجد، باب فضل المسجد الاقصی والصلاۃ فیہ۔

(٥) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ذکر المسیح ابن مریم والمسیح الدجال۔

(٦) سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب خروج المھدی۔

(٧) سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاءِ فی النھی عن سب الریاح۔

(٨) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم النحر۔ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد۔

(٩) سنن ابی داوٗد، کتاب المناسک، باب فی المواقیت۔

(١٠) سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، باب ثواب من توضأ کما امر۔

(١١) سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب ما جاءِ فی الصلاۃ فی المسجد الجامع۔